ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اِصلاحی رجحانات

مقالہ برائے

پی ایچ. ڈی (اُردو)

ویر بہادر سنگھ پوروانچل یونیورسٹی جونپور (اتر پردیش)

زیرنگرانی

Munawwar Anjum

ڈاکٹر منور انجم

سابق صدر شعبہ اُردو

ڈی.سی.ایس.کے.پی.جی.کالج، مئو

(یو.پی)

مقالہ نگار

Aftab Alam

آفتاب عالم

ریسرچ اسکالر

ڈی.سی.ایس.کے.پی.جی.کالج، مئو

(یو.پی)

شعبۂ اُردو

ڈی.سی.ایس.کے.پی.جی.کالج، مئو (اتر پردیش)

DEPUTY NAZEER AHMAD KE NOVELON MEIN ISLAHI RUJHANAT

THESIS IN URDU

for

Ph.D.

V.B.S. PURVANCHAL UNIVERISTY JAUNPUR

Supervised by

Dr. Munauwar Anjum

Ex. Head of the Department of Urdu

D.C.S.K. P.G. College,
Mau (U.P.)

Submitted by

Aftab Alam

Research Scholar

D.C.S.K. P.G. College,
Mau (U.P.)

DEPARTMENT OF URDU

D.C.S.K. P.G. College, Mau (U.P.)

Dr. Munauwar Anjum
M.A., Ph.D.
HEAD
Department of Urdu
D.C.S.K. P.G. College
Maunath Bhanjan
PIN - 275101
(M): 9838707663

ڈاکٹر منور انجم
ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی
صدر شعبۂ اردو
ڈی۔سی۔ایس۔کے۔ پوسٹ گریجویٹ کالج
مئوناتھ بھنجن مئو (یو۔پی۔)

CERTIFICATE

Certified that **Mr. AFTAB ALAM** *has completed his research* **THESIS** *on the topic* **" DEPUTY NAZEER AHMAD KE NOVELON MEIN ISLAHI RUJHANAT"** *for* **Ph.D.** *in* **URDU** *subject as a Research scholor under my supervision at the centre, D.C.S.K. Post Graduate College, Mau(U.P.). I further certify that the THESIS is upto the mark and satisfactory. It shows the deep and thoughtful study of the Research Scholar. He has fulfilled all the requirements prescribed by* **V.B.S. PURVANCHAL UNIVERSITY, JAUNPUR** *to submit the* **THESIS** *mentioned.*

21/04/2015
PRINCIPAL
Principal
D.C.S.K.Post Graduate Collge
Mau Nath Bhanjan- Mau

Munauwar Anjum
Dr. MANAUWAR ANJUM
SUPERVISOR

20532

Residence: **ANJUM KADA,** Ahmad Nagar (Kamhria). Bypass Road. Maunath Bhanjan, Mau-275101 (U.P.)

HaSnain SIalvi

خاکہ

□□□□

حرف آغاز

اُردو زبان وادب کے میدان میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ادبی عبقریت اور علمی بصیرت سے کسی طرح سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے مختلف موضوعات ومضامین پر اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کیا ہے۔ مختلف اصناف ادب پر تخلیقی و تصنیفی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن بطور خاص ناول نگاری کے میدان میں انھیں بے پناہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ ناول نگاری کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عام طور پر اصلاحی رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس مقالے میں ان کے اصلاحی میلانات ورجحانات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالہ ہذا حرف آغاز اور حرف آخر کے علاوہ پانچ ابواب اور کتابیات پر مشتمل ہے۔

مقالہ کے باب اول میں نذیر احمد کی سوانح اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ان کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کے خاندانی حالات کے معاملات ومسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تعلیمی لیاقت اور شعری و ادبی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان کی ادبی شخصیت اور علمی حیثیت منظر عام پر آجائے اور اس پس منظر میں ان کی تصنیفات وتخلیقات کا مطالعہ آسان ہوجائے۔

مقالہ کے باب دوم میں نذیر احمد کی اصلاحی تحریک اور علی گڑھ تحریک دونوں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ علی گڑھ تحریک نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں قومی و اصلاحی جذبات کو کس طرح متاثر کیا اور سرسید کی تعلیمی و تہذیبی مشن نے ڈپٹی نذیر احمد کو کس قدر حوصلہ بخشا کہ سرسید تحریک سے وابستہ ہو گئے اور علی گڑھ تحریک کا ایک اہم حصہ بن گئے۔

مقالہ کے باب سوم میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے مختلف ادوار کے پس منظر میں ان کے ناولوں میں اصلاحی رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور متعلقہ ناولوں کے کرداروں اور ان کے مکالموں کے ذریعہ قوم وملت کی اصلاح اور معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں بطور خاص کرداروں کو زمانے کی جدید اقدار سے روشناس کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پرانی تہذیب (اسلامی تہذیب) کا احترام کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور زمانے کے جدید تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنا ہے جن سے ہمارے معاشرے میں روشن خیالی اور تہذیبی بیداری آ سکتی ہے۔

مقالہ کے باب چہارم میں ڈپٹی نذیر احمد کے تراجم و تفاسیر میں لسانی و ادبی جدت پسندی سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور فکری بصیرتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی زبان اور انداز بیان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالہ کے باب پنجم میں ناولوں کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد کی چند دیگر تصنیفات و تالیفات میں اصلاحی رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس ضمن میں ان کے ذہنی رجحانات کے پس منظر میں قوم وملت کی اصلاحی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالہ کے آخر میں ان کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن سے اپنے مقالہ نویسی کے دوران استفادہ کیا ہے اور اپنے مقالہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے ان سے مواد حاصل کیا ہے۔

اس تحقیقی مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں سب سے پہلے میں اپنے استاذ گرامی ڈاکٹر منور انجم صاحب جو میرے تحقیقی مقالہ کے نگراں (Research Supervisor) ہیں ان کا بیحد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مقالہ نویسی کے دوران بڑی شفقت اور محبت سے میری رہنمائی کی اور اپنے مخلصانہ مشوروں سے نوازا۔ میں محترم ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کے خلف الرشید عالیجناب ابصار احمد صاحب کا بھی رہن منت ہوں کہ انھوں نے اس مقالہ نویسی کے موضوع سے متعلق مواد فراہم کرنے میں میری مدد کی۔ میں اپنے ہمدم دیرینہ ذکی احمد محفوظ (ایڈوکیٹ) اور اپنی رفیقہ حیات مسز افروز جہاں کا بھی بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی۔ اور جناب عزیر احمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں کہ انھوں نے اس مقالہ کی ٹائپ نویسی اور کمپوزنگ میں میری بھرپور اعانت کی۔

مجھے امید ہے کہ مقالہ ہذا ڈپٹی نذیر احمد کے علمی و ادبی کارناموں کے تناظر میں ان کے اصلاحی رجحانات کو اجاگر کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگا؛ ان شاء اللہ۔

ریسرچ اسکالر

ڈاکٹر آفتاب عالم

بی۔یو۔ایم۔ایس (علیگ)

باب اوّل

ڈپٹی نذیر احمد کے سوانحی حالات

اُردو زبان وادب کے میدان میں بہت سی باکمال شخصیتیں عالم وجود میں آئیں جنھوں نے اپنے قابل قدر کارناموں سے زبان وادب کو معراج تک پہنچادیا، انھیں باکمال ہستیوں میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ نذیر احمد بنیادی طور پر اُردو ناول نگاری کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اُردو ادب میں نہ صرف ناول نگاری کے فن کو فروغ بخشا بلکہ اس صنف ادب کو انگریزی زبان کے ناولوں کا ہم پلہ قرار دیا۔ انھوں نے اپنی ناول نگاری کے ذریعہ بطور خاص اصلاح معاشرہ کا کام لیا اور اس طرح انھوں نے اپنی تحریر وتقریر کی بدولت قوم وملت کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور اسے منزل مقصود کی طرف گامزن کردیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین رقمطراز ہیں:

> ''عام طور ر اُردو کی ناول نویسی کا بانی سرشار کو خیال کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں نذیر احمد اُردو کے سب سے پہلے ناول نویس ہیں اس لئے کہ ان کی تصانیف بنات النعش (۱۸۷۳ء)، مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) سرشار سے بہت قبل شائع ہو چکی تھیں۔'' [۱]

اس سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اُردو —— ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص:۲۳۶

> ''غدر کے بعد معاشرت اور ادب میں اصلاح پسندوں کا دور دورہ ہوا ان میں نذیر احمد بھی تھے۔ انھوں نے سحر اور جادو سے بھرے ہوئے ایسے قصوں کو جن میں محبت کا ایک عجیب سا تصور تھا مخرب اخلاق سمجھ کر ایسے اصلاحی افسانے لکھنے کی کوشش کی جو زندگی سے قریب بھی ہوں اور زندگی کو سنوارنے میں بھی مدد دیں۔'' [1]

عام روایت کے مطابق کسی شخصیت پر مقالہ تحریر کرنے کے لئے سب سے پہلے اس شخصیت کی خاندانی زندگی کے پس منظر اور پیش منظر کو مدنظر رکھنا ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے مقالہ ہذا کے اس باب میں ڈپٹی نذیر احمد کے خاندانی حالات کے ساتھ ان کا سوانحی خاکہ اجمالی طور پر پیش کرنا مقصود ہے۔

جائے پیدائش

ڈپٹی نذیر احمد کے والد جناب مولوی سعادت علی کو ان کے نانا قاضی غلام علی شاہ صاحب نے خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ موصوف موضع ریہڑ، پرگنہ افضل گڈھ، تحصیل نگینہ، ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ انھیں کے گھر ۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء بروز شنبہ نذیر احمد پیدا ہوئے۔

علاوہ ازیں نذیر احمد کی پیدائش کے سلسلے میں حامد حسن قادری اپنی کتاب ''داستان تاریخ ادب اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''نذیر احمد ۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء مطابق ۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۲۵۲ھ کو

---

[1] معیار و میزان —— ڈاکٹر مسیح الزماں ص:۱۳۲

بمقام موضع ریہڑ، پرگنہ افضل گڈھ، تحصیل نگینہ، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔'' [1]

مگر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اپنے مقالہ ''مولوی نذیر احمد دہلی - احوال و آثار'' میں اس کی تردید کرتے ہوئے سنہ پیدائش کا تعین ۱۸۳۱ء کیا ہے۔ اور بھی کئی مصنفوں نے نذیر احمد کا سال پیدائش ۱۸۳۱ء ہی دیا ہے۔ لیکن خود نذیر احمد نے ترجمہ ''تعزیرات ہند'' کے صلے میں ڈپٹی کلکٹری کے لیے حکومت جو کوائف مہیا کیے تو ان میں عمر ۲۱ ستمبر ۱۸۳۳ء بیان کی۔ مالک رام نے توبۃ النصوح کا تعارف لکھتے ہوئے ۱۸۳۳ء ہی کو ان کی تاریخ پیدائش مانا ہے۔ اگر نذیر احمد کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو کیا دہلی کالج میں داخلے کے وقت نذیر احمد کی عمر ۱۲ سال تھی۔ ۱۸۳۱ء کے لحاظ سے ۱۴ سال ہوتی ہے یہ عمر تو قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ۱۸۳۱ء ہی نذیر احمد کی تاریخ پیدائش زیادہ قرین قیاس ہے۔

نام و نسب

نذیر احمد کا نام ان کے والد ماجد نے رکھا تھا۔ ان کی کوئی عرفیت نہیں تھی اور نہ ہی اپنے اصلی نام کے علاوہ کسی اور نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد مولوی سعادت علی کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے نامور خلفاء میں سے ایک بزرگ شاہ عبدالغفور اعظم پوری (بجنور) سے ملتا ہے۔ غرضیکہ ڈپٹی نذیر احمد نے ایک مشہور دیندار گھرانے میں جنم لیا جس پر انھوں نے خود بھی فخر کا اظہار کیا ہے:

''مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ابا عن جد موروثی مسلمان ہوں

---

[1] داستان تاریخ ادب اُردو حامد حسن قادری ص:۵۸۶

اور اپنے نسب نامے میں انقراض سلطنت دہلی تک کے بلافصل مشائخ و مفتی
اور علماء کے نام پاتا ہوں۔" [1]

یہ حقیقت ہے کہ نذیر احمد شاہ عبدالغفور اعظم پور کی اولاد میں سے ہیں اور اعظم پور ضلع بجنور میں ہے۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے مشاہیر اولیاء اللہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ اسی طرح مولوی نذیر احمد کا ننھیال بھی علماء کے خاندان میں تھا جو شاہی زمانے میں قاضی رہ چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ مصنف و مؤلف "حیات النذیر" کے بموجب ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد چار برس کی عمر تک ریہڑ میں رہے لیکن ان کے نانا قاضی غلام علی شاہ انتقال کر گئے تو جدی جائیداد کا تنازعہ کھڑا ہوا تو ان کے والد مولوی سعادت علی صاحب اپنی اہلیہ (والدہ نذیر احمد) کو لے کر بجنور منتقل ہو گئے اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ بجنور پہنچ کر مولوی سعادت علی نے کچھ دنوں تک شکر (کھنڈسازی) کا کام کیا لیکن یہ کام ان کی طبیعت کے موافق نہ تھا لہٰذا اسے چھوڑ کر معلمی کے پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۱۶

نسبتی تفصیلات
اور
خاندانی حالات
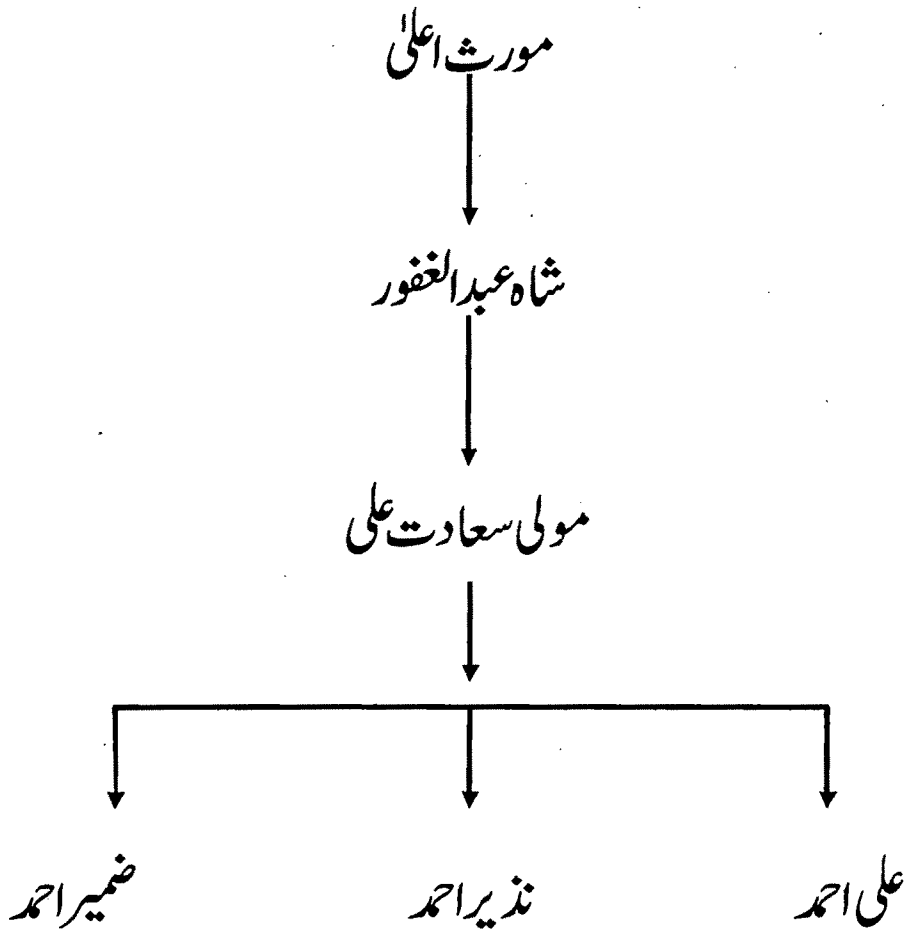
لیکن بقول جمیل اختر:

"مولوی سعادت کی کل چھ اولادیں ہوئیں۔علی احمد، نذیر احمد، ضمیر احمد، جلیا، متیا، چھوٹی لڑکی یعنی تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔نذیر احمد کا نمبر دوسرا تھا۔

نذیر احمد کے والد ماجد صوم وصلوٰۃ کے پابند اور بڑے نیک انسان تھے۔انھیں فارسی اور عربی زبان میں بڑی مہارت حاصل تھی۔شعروادب کا بھی نہایت صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کی طبیعت میں بھی موزونیت موجود تھی۔

نذیر احمد کے بڑے بھائی علی احمد عربی زبان کے عالم اور پایہ کے ادیب تھے۔انھوں نے نذیر احمد کے ساتھ دلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔تعلیم سے فارغ ہو کر وہ کافی دنوں تک سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے اور ایک عرصہ تک بریلی کالج میں عربی استاد بھی رہے۔آخر میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقۂ بجنور مقرر ہوئے۔اسی منصب سے آخر کار سبکدوش ہوئے اور پنشن پائی۔ ۱۷ردسمبر ۱۹۹۰ء کو بجنور میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

نذیر احمد کے چھوٹے بھائی ضمیر احمد اپنی ماں کے پاس رہتے تھے۔انھیں ماں کے بےجا لاڈ پیار نے بگاڑ رکھا تھا اس لیے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ نذیر احمد جب گھورکھپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے تو انھوں نے ضمیر احمد کو اپنے پاس بلا لیا اور ملازمت سے لگوا دیا۔کچھ دنوں تک میونسپلٹی میں ملازم رہے اس کے بعد محکمۂ پولیس میں تھانے دار ہوئے۔کسی طوائف سے شادی بھی کی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔۳۰ردسمبر ۱۹۰۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔" [۱]

---

[۱] ؎

تعلیم وتربیت

ڈپٹی نذیر احمد نے حسب دستور قرآن مجید گھر پر پڑھا اس کے بعد مکتب بھیجے گئے مگر ان کے والد مکتب کی پڑھائی سے مطمئن نہ تھے اس لئے انھوں نے نذیر احمد کو مکتب سے بلا لیا اور خود گھر پر تعلیم دینا شروع کر دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد بے حد ذہین تھے اس لئے بچپن میں ہی دوسری کتب کے علاوہ مینا بازار، پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری ختم کر لی اور فارسی کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ عربی کی بھی پڑھائی کی اور کم عمر میں ہی فارسی کی استعداد بہم پہنچائی۔ والد نے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی ان کو شریفانہ زندگی گذارنے کے طور وطریقے سکھائے۔ یہ ان کے والد کی تعلیم و تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے تمام عمر ریاضت، مشقت اور سلیقے سے گذاری۔

ڈپٹی نذیر احمد جب چھ برس کے ہوئے تو ان کے والد انھیں اپنے وقت کے جید عالم مولانا نصر اللہ خاں صاحب خورجوی کی شاگردی میں دے دیا جو ان دنوں بجنور میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ تقریباً ۵ ربرس تک ڈپٹی نذیر احمد مولانا نصر اللہ خاں صاحب کے حلقہ درس میں رہے۔ اتفاق سے ڈپٹی صاحب کا تبادلہ اعظم گڈھ ہو گیا تو انھوں نے مولوی سعادت علی کو مشورہ دیا کہ اب ان کو دہلی لے جا کر پڑھاؤ۔ اس طرح مولوی سعادت علی صاحب ان کو لے کر دہلی پہنچے اور وہاں ۱۸۴۲ء میں مولوی عبدالخالق صاحب پیش امام متولی شاہی مسجد کے سپرد کر دیا۔ عبدالخالق صاحب نے انھیں پنجابی کٹرہ کی مسجد میں رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اس مسجد میں مولوی عبدالخالق صاحب نے درس وتدریس کا کام شروع کر رکھا تھا اور یہ سلسلہ تقریباً ۳ رسال تک چلا۔[1]

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد — ڈپٹی نذیر احمد ص:۴

دہلی میں مولوی صاحب کی حلقہ درس میں شمولیت اگرچہ کئی لحاظ سے اہم ہے تاہم افتخار احمد بلگرامی (مصنف حیات النذیر) نے لکھا ہے:

''یہاں وہ بہت جبر کے ماحول میں ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے
تھے یہاں تک کہ محلے سے روٹیاں مانگ کر لاتے۔'' [1]

مولوی صاحب کے گھر میں ملازموں کی طرح سودا سلف لاتے، بچہ کھلاتے اور مصالحہ پیتے جس پر ایک لڑکی (بعد میں ان کی اہلیہ) بٹہ مار مار کر ان کی انگلیاں کچل دیتی اور ان سب سے مستزاد مسجد میں مار پٹائی۔ غرض نذیر احمد پر اس زمانے میں طرح طرح کی مصیبتیں گذریں۔

ڈپٹی نذیر احمد چونکہ فطرتاً ذہین تھے اور علم حاصل کرنے کی لگن انھیں بے چین کر رکھی تھی اس لئے مسجدوں کی زندگی اور مولویوں کی خدمت گاری سے بہت دل برداشتہ تھے۔ اس زمانے میں دہلی کالج کی بڑی شہرت تھی۔ یہ کالج معیاری کالج سمجھا جاتا تھا۔ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی اور سائنس، معلومات عامہ کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ حسن اتفاق سے اس کالج کے پرنسپل جناب گارگل سے نذیر احمد کی ملاقات ہوگئی اور انھوں نے نذیر احمد کی خواہش کے مطابق دہلی کالج میں داخلہ دینے کا وعدہ کرلیا اور ۱۸۴۵ء میں نذیر احمد دہلی کالج میں داخل ہوگئے اور داخلے کے ایک ماہ بعد چار روپے کا وظیفہ مقرر ہوگیا اور نذیر احمد کو مسجد کی گدایانہ زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۳ رسال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ نذیر احمد جواب تک تعلیم و تعلّم کے معاملے میں ذرا بے توجہی سے کام لے رہے تھے۔ والد کے انتقال کے

[1] حیات النذیر —— افتخار احمد بلگرامی

بعد شب و روز کتابیں چاٹنے پر تل گئے۔ نذیر احمد کو ریاضی اور تاریخ سے بالکل دلچسپی نہ تھی شاید اس لئے کہ ان کا میلان طبع ادب کی طرف زیادہ تھا لیکن چونکہ ریاضی اور تاریخ کے طلباء کو وظائف بھی ملا کرتے تھے اس لئے نذیر احمد کو بادل نخواستہ وظیفہ پاتے رہنے کی غرض سے ان مضامین میں بھی محنت کرنی پڑتی تھی۔

دہلی کالج سے نذیر احمد کو تعلیم کے اعتبار سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا اس لئے کہ عربی اور فارسی وہ پہلے ہی سے خاصی جانتے تھے اور چونکہ وسیع المطالعہ تھے اس لئے عربی اور فارسی میں خاصی دسترس رکھتے تھے۔ سائنس، ریاضی اور تاریخ سے انھیں دلچسپی نہ تھی البتہ محنت کر کے امتحانات میں ضرور پاس ہو جایا کرتے تھے۔ فائدہ صرف یہ ہوا کہ کالج سے وظیفہ ملتا رہا اور اس سے تعلیمی سلسلے کو کافی مدت تک جاری رکھ سکے۔ تاہم انھوں نے دہلی کالج سے متعلق اپنے تاثرات کا جو اظہار فرمایا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے:

> ''معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر)، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد، اعلیٰ بصیرت' یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا؟ مولوی ہوتا تنگ نظر، متعصب اور اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ اور دوسروں کے عیوب کا متجسس بر خود غلط ؎
>
> ترک دنیا بمردم آموزند
> خویشتن سیم و غلہ اندوزند
>
> مسلمانوں کا نادان دوست تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا اور بہرا۔'' [1]

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) —— ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص:۱۶

شادی وخانہ آبادی

دہلی کالج میں نذیر احمد کی لیاقت، صلاحیت، ہونہاری اور ذہانت کے چرچے ہو رہے تھے اسی اثناء میں مولوی عبدالخالق صاحب نے اپنے بڑے بیٹے مولوی عبدالقادر صاحب کو مسجد کی امامت اور دوسرے فرائض سونپ دیئے۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی سب سے بڑی بیٹی صفیۃ النساء اب ماشاء اللہ بالغ و باشعور تھی چنانچہ عبدالقادر صاحب نے اپنی صاحبزادی کی نسبت ڈپٹی نذیر احمد سے کردی۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جنھیں نذیر احمد کبھی گود میں لئے پھرتے تھے۔ نذیر احمد نے یہ شادی والدین کی مرضی کے بغیر اپنی مرضی سے کی تھی جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی بغاوت تھی چنانچہ نذیر احمد کی والدہ نے حسب منشاء بجنور میں ان کی دوسری شادی کرادی مگر یہ شادی نبھ نہ سکی اور جلد ہی طلاق ہوگئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔

نذیر احمد ہمیشہ سے بڑے خوددار اور غیرت مند واقع ہوئے تھے۔ ان کا سسرال خوشحال تھا اور سسرال والے چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں مگر وہ سسرال سے دور ہی رہتے تھے یہاں تک کہ معمولی سے معمولی تحفے و تحائف بھی قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مزاج کے تیکھے پن کی وجہ سے اکثر سسرال والے بددل بھی رہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی آزردہ اور ناخوشی کا اظہار کرتی تھیں مگر مولانا ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً

> ''تم اس کو میری ناخوشی اور ناراض مندی پر محمول نہ کرو۔ خدا اپنی قدرت سے مجھ کو فارغ البالی دے گا تو تم دیکھ لوگی کہ تم کو کیسا خوش رکھتا ہوں۔ یہ تنگدستی انشاء اللہ چند روزہ ہے تم کو بددل نہ ہونا چاہئے۔'' [1]

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ——ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص:۱۵

اولاد واقارب

ڈپٹی نذیر احمد کثیر الاولاد تھے۔ ان کو کل بیس بچے ہوئے لیکن صرف تین اولاد دو بیٹیاں سکینہ بیگم اور صغریٰ بیگم اور ایک بیٹے بشیر الدین احمد نے لمبی زندگیاں پائیں۔ ان کے علاوہ سات برس کا ایک لڑکا ہیضہ سے گذر گیا۔ جس کا عربی مرثیہ نذیر احمد نے لکھا ہے۔ ایک اور لڑکا بھی ہیضہ سے ہی گذر گیا۔ بڑی لڑکی سکینہ بیگم مولوی سید احمد حسین صاحب کی اہلیہ تھیں۔ دوسری لڑکی صغریٰ بیگم خان بہادر مولوی اشرف الحق سے بیاہی گئیں۔ تیسرے لڑکے بشیر الدین احمد کی شادی نواب قطب الدین مرحوم کی پوتی امت المغنی سے ہوئی۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی تو بیس سال انتظار کے بعد سید زمانی بیگم سے دوسری شادی کی اس سے بھی کافی تاخیر سے ہی سہی لیکن اولاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے تیسری بھی شادی کی۔ دونوں بیویوں سے گیارہ اولادیں ہوئیں۔

قدوقامت اور شکل وشباہت

نذیر احمد کے قدوقامت کے بارے میں بہت سے مصنّفین نے اپنی تصنیفات میں تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی تصنیف میں ''نذیر احمد کی کہانی - کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

> ''قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا، بدن موٹاپے کی طرف مائل تھا، رنگ سانولا تھا، کمر کا گھیرا ضرورت سے زیادہ تھا، تو ند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ازار بند باندھنا تکلیف دہ ہوتا تھا اس لئے گھر کے اندر گرمیوں میں زیادہ تر تہد باندھتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر سر پر بال بہت کم تھے اور جو

تھوڑے بہت بال تھے وہ اکثر صاف کر دیئے جاتے تھے۔آنکھیں چھوٹی
چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھنویں گھنی تھیں اور آنکھوں میں غضب کی
چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔بچپن میں
ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا
ہوجاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم
ہونے لگا تھا اس لئے ان کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔جبڑا بہت
زبردست پایا تھا، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ،کوئی دور سے سنے تو یہ
سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھے تو ہنسی کے مارے
لوٹ پوٹ ہورہا ہوتا۔ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری۔متانت چھوکر
نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار (چال) میں خود بخود متانت پیدا
کر دی تھی۔ڈاڑھی بہت ہی ہلکی تھی ایک ایک بال آسانی سے گنا جاسکتا تھا۔
کلے کے بال صاف نہیں ہوتے تھے البتہ تھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کرلیا
جاتا تھا،گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔"[1]

لباس اور وضع قطع

نذیر احمد کے لباس کے بارے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں
زمین و آسمان کا فرق تھا اگر ان کو روزانہ گھر سے باہر نہ جانا ہوتا تو لباس کا خرچ ان کے اخراجات
کی فہرست سے نکل جاتے۔عموماً جب شام کو گھر سے نکلتے تھے تو ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ
باندھ کر نکلتے تھے۔گرمیوں میں نہایت صاف و شفاف اچکن اور سفید کرتا یا پاجامہ ہوتا اور
جاڑوں میں کشمیر کی اچکن کا کشمیری کام کا جبہ ہوتا تھا اور چونکہ سراج الدولہ صاحب سے لین

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص:۳۱

دین تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتہ استعمال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مرزا فرحت اللہ اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''گھر کے اندر مولوی صاحب کچھ الگ انداز میں رہتے تھے۔ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دروازے میں سے ایک کھلا ہے باہر بڑھیا ٹھونس چمارنی بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے اور مولوی صاحب کے لباس کا حال یہ تھا کہ خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس بھی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتا ہے اور نہ ٹوپی نہ پاجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے البتہ کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے ایک طرف پلنگ بچھا ہے کبھی چادر ہوتی ہے اور کبھی اس پلنگ پر چادر نہیں ہوتی ہے۔'' [1]

نذیر احمد جاڑوں میں مکان کے اوپری حصے میں رہتے تھے یہاں پر ان کی نشست ایک بڑے کمرے میں ہوتی تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش رہتا اس پر قالین پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی سی نیچی میز، پہلو میں حقہ۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بڑا شوق تھا یوں سمجھئے جاڑے کا موسم ہے مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں ادھر گھڑی میں ۴ ؍بجے اور مولوی صاحب نے آواز لگائی ''پانی تیار ہے'' جواب ملا ''جی ہاں''۔ مولوی صاحب غسل خانے میں جاتے ہیں اور کپڑے بدل کر باہر نکل آتے ہیں اور ٹاؤن ہال کو چل دیتے ہیں۔

جرمن کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پسند ان کی پابندیٔ اوقات کو یوروپ والوں کا حصہ خیال کرتے ہوں تو کریں مگر صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھنے کو ملے جو آندھی آئے یا مینھ

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی ــــــ مرزا فرحت بیگ دہلوی ص: ۳۳

آئے روزانہ ۶/بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آجاتے تھے ایسا ہوتا تھا کہ اِدھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اُدھر گھنٹہ گھر نے ۶/بجائے۔ یہ تین شخص تھے ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال جی اور تیسرے مولوی نذیر احمد صاحب بنفس نفیس جو وقت کے بڑے پابند تھے۔

مذہب اور عقیدہ

مولوی نذیر احمد ہمیشہ صبح میں بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اٹھتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر نہاتے، وضو کرتے اور نماز پڑھتے۔ ان کی صبح اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہیں ہوتی تھی۔ باقی کا حال بقول مرزا فرحت اللہ بیگ ''اللہ اعلم بالصواب''۔

صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت قرآن پاک کرتے۔ ویسے تو مولوی صاحب کے یہاں تصنیف وتالیف کا سلسلہ ہمیشہ ہی رہا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا بڑا شوق تھا اور اس غرض کو حاصل کرنے میں ان کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ تھا۔ بے دریغ روپئے دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے۔ جس طرح دل کھول کر روپئے دیتے تھے اسی طرح سختی سے حساب بھی لیتے۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ:

> ''گرمی ہو یا جاڑہ، دھوپ ہو بارش قرض داروں کے وہاں ان کا روزانہ کا چکر نہیں چھوٹتا تھا اور جاتے ہی پہلے ''غلق'' پر قبضہ کیا اس کے بعد کھاتہ دیکھا' سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا' روپئے جیب میں ڈالا'' ''سلامُ علیکم، وعلیکم السلام'' اور چل دیئے۔'' [1]

---

[1] نذیر احمد کی کہانی - کچھ میری کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص:۳۹

نذیر احمد لین دین سب کچھ کرتے مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں ہوتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا کرتے تھے لیکن کبھی بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہئے وہ انھوں نے کبھی نہیں رکھا۔ سود لینا جائز سمجھتے تھے اگر کوئی حجت کرتا تو بہت ساری تاویلوں سے ان کا ناطقہ بند کر دیتے تھے کیوں کہ ایک تو حافظ دوسرے عالم تیسرے ماہر انسانی نفسیات، بھلا کون جیت سکتا تھا؟ چنانچہ وہ اپنی بحث سے لوگوں کو قائل کر دیتے تھے۔

اس سلسلے میں بذات خود مرزا فرحت بیگ دہلوی نے اپنی کتاب ''مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' میں اپنے ایک ذاتی معاملہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم پر متفرق قرضے تھے۔ خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ جب غور کرتے تو مولوی صاحب پر ہی نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن ہمت کر کے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے 'کتنا روپیہ چاہئے؟' میں نے کہا 'بارہ ہزار'۔ بولے 'ضمانت؟' میں نے کہا 'جوڑی والا مکان'۔ پوچھا 'کتنی مالیت کا ہے؟' میں نے کہا 'کوئی ساٹھ ستر ہزار روپئے کا'۔ فرمایا 'کل قبالہ لیتے آنا'۔ میں نے سوچا چلو چھٹی ہوئی بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا۔ پڑھ کر کہا 'ٹھیک ہے مگر بیٹا سود کیا دو گے؟' میں نے کہا مولوی صاحب آپ اور سود؟ کہنے لگے 'کیوں اس میں حرج کیا ہے؟ نہ دوں گا تو ساہوکار سے لو گے۔ اس کو خوشی سے سود دو گے۔ ارے میاں! مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں؟ میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں؟ جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے تصفیہ کرآؤ، کل ہی چیک بنگال بینک کے نام لکھ دیتا ہوں' میں نے کہا 'مولوی

صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے اپنے شاگرد سے۔ کہنے لگے' پرواہ نہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا؟ جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا۔'

میں نے گھر آ کر اس کا ذکر کیا تو دوسری سے آٹھ آنے سیکڑے سود پر روپے مل گئے اس لئے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا۔'' [1]

ملازمت اور معاشی حالات

والد ماجد کے انتقال کے بعد ڈپٹی نذیر احمد پر اپنے گھر والوں کی سرپرستی اور کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا تھا اور شب و روز متفکر رہتے تھے کہ کس طرح ان سب کی کفالت کی جائے۔ عربی کی کتابوں کی تصحیح اور تراجم سے کچھ پیسے اکٹھا کر لیتے تھے اس کے علاوہ اپنا وظیفہ اور اپنے بڑے بھائی کے وظیفے کی رقم شامل کر کے اپنا اور اپنے گھر والوں کا سہارا بنے رہے۔ ابھی دہلی کالج سے فارغ ہونے میں کچھ دن باقی تھے کہ نذیر احمد کو معلوم ہوا کہ ضلع گجرات (پنجاب) میں سر رچرڈ ٹمپل (Sir Rechard Temel) ڈپٹی کمشنر ایک سررشتہ قائم کرنے والے ہیں جن میں عربی کے چھ معلّموں کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ڈپٹی نذیر احمد کالج کے پرنسپل سے ملے اور ان کے توسط سے نذیر احمد کو ۴۰/روپئے ماہوار تنخواہ پر کنجاہ میں مدرس متعین کیا گیا۔

نذیر احمد اپنی ملازمت سے زیادہ خوش نہ تھے۔ دوری اور ماحول کے فرق کی بنا پر شاید ان کا دل وہاں نہ لگا۔ چنانچہ انھوں نے اِدھر اُدھر ملازمت کے لئے درخواست بھیجنا شروع کر دیں

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص:۴۱

جس کے نتیجہ میں احمر کالج سے ۱۰۰؍روپئے ماہوار پر عربی مدرسی اور کانپور سے ۸۰؍روپئے ماہوار کی انسپکٹری کی پیش کش ہوئی۔ نذیر احمد نے کانپور جانا پسند کیا اور وہاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کانپور میں اس وقت کپتان فلر (Cult Fuller) صاحب انسپکٹر مدارس دوم تھے۔ یہ انسپکٹر صاحب فوجی آدمی تھے اور غصیلے بھی واقع ہوئے تھے۔ نذیر احمد صاحب کی ان سے نہ بنی اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ دینے کے بعد دہلی کو روانہ ہو گئے۔

ان ایام میں ڈائریکٹر تعلیمات اسٹوارٹ ریڈ (Steward Reade) بھی دہلی کے لال قلعے میں مقیم تھے۔ ان کے میر منشی مولوی کریم بخش تھے جن کی وساطت سے نذیر احمد کو الٰہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر کا عہدہ پیش کیا گیا اور نذیر احمد الٰہ آباد پہنچ گئے۔ الٰہ آباد پہنچ کر نذیر احمد نے ملازمت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تحصیل پر بھی اپنا وقت صرف کیا۔ در اصل نذیر احمد کے والد مولوی سعادت علی صاحب بڑے دیندار تھے۔ وہ انگریزی تعلیم سے سخت متنفر تھے چنانچہ انھوں نے نذیر احمد کو اپنے جیتے جی انگریزی نہ پڑھوائی۔ وہ زمانہ کچھ ایسا تھا کہ انگریزی سے مسلمانوں کا ایک گروہ بہت دور رہنا چاہتا تھا۔ نذیر احمد نے اپنے والد کے انگریزی سے اس قدر تعصب کو لاہور کے ایک لکچر میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں بھی انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو کہ ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار صاف کہہ دیا مجھے اس کا مرنا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارہ نہیں۔'' [1]

گویا نذیر احمد نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں انگریزی نہیں پڑھی البتہ الٰہ آباد میں

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ــــ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص: 19-18

جب وہ ڈپٹی انسپکٹر ہو کر پہنچے تو ایک انگریز داں عبداللہ خاں امین عدالت کے یہاں قیام کیا اور عبداللہ خاں صاحب نے نذیر احمد کو انگریزی سیکھنے کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ نذیر احمد نے انگریزی کی حکایت الف لیلیٰ سے درس لینا شروع کیا۔ نذیر احمد کا حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے انھوں نے جلد ہی اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں:

"میں نے انگریزی سبقاً سبقاً ترتیب سے نہیں پڑھی انگریزی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی مگر چونکہ عربی بہت ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لئے ایسا سہل کر دیا کہ جو مدرسہ کے لڑکے برسوں میں کرتے ہیں میں نے مہینوں میں کر لیا۔"[1]

غرض نذیر احمد جہاں سے اور جیسے بھی موقع ملتا انگریزی سیکھنے کے شوق کو پورا کرتے تھے۔ نذیر احمد کے پاس باقاعدہ طور پر کوئی انگریزی کی ڈگری نہیں تھی لیکن انھوں نے محنت اور شوق سے اس قدر لیاقت پیدا کر لی تھی کہ اس وقت کے گریجوئٹ بھی ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ریڈ (Reade) صاحب نے ان کی انگریزی کی صلاحیت دیکھ کر پینل کوڈ کے ترجمے میں شریک کر لیا۔

نذیر احمد کی انگریزی دانی اور ترجمہ نگاری کا عام چرچہ ہونے لگا۔ انڈین پینل کوڈ (قانون تعزیرات ہند) کے ترجمے میں وہ شریک غالب تھے۔ ان کے دوسرے شرکاء منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش تھے۔ اس کے صلے میں ان کو ولایت سے ایک گھڑی جس پر ان کا نام کندہ تھا بطور عطیہ دی گئی اور ڈپٹی کلکٹر کے لئے نامزد بھی کیے گئے۔

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) —— ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص:۱۹

ترجمے کا کام ختم کرنے کے بعد سر ولیم میور (Sir Willium Muir) کے داماد مسٹر لو (Mr. Low) کے پاس سلام کو گئے۔ مسٹر لو نے خوشخبری سنائی کہ کانپور میں تحصیلدار کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ ان کے اسرار پر ڈپٹی نذیر احمد کانپور چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۶۱ء کا ہے۔ تحصیلداری کا امتحان بھی ہونے والا تھا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا لیکن نذیر احمد نے ۳رماہ کی محنت شاقہ سے تحصیلداری کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کرلیا۔ اس کے بعد ضابطہ فوجداری (جو تعریزات ہند ہی کا ایک حصہ ہے) کی تصحیح فرمائی۔ یہ ترجمہ بے حد پسند کیا گیا۔ اس کا صلہ یہ ملا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر کے لیے منتخب ہو گئے۔

ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ

نذیر احمد تحصیلداری کے عہدے سے ترقی کر کے ۱۸۶۳ء میں کانپور ہی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر بٹھائے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ کانپور سے گورکھپور پھر جالون ضلع میں ہوا لیکن کچھ دنوں بعد پھر گورکھپور آ گئے۔ گورکھپور میں انھوں نے قانونِ شہادت کے عالمانہ متن کا ترجمہ کیا۔ یہاں سے تبادلہ کر کے اعظم گڈھ تشریف لے گئے۔ یہ جگہ ملازت کے لحاظ سے زیادہ خوشگوار نہ تھی لیکن تصنیف و تالیف کا موقع نسبتاً زیادہ ملا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے انگریزی کتاب ''کولمز ہیونز'' کا ترجمہ ''سوات'' کے نام سے کیا۔ اس کتاب پر نذیر احمد کو حکومت برطانیہ سے ایک ہزار روپۓ بطور انعام ملا۔ بعض اسباب کی بنا پر اس کتاب کو ترجمے کی اصلاح کے لئے حیدر آباد بھیجا گیا۔ وہاں اسے پسند کیا گیا اور نظام سرکار میں اس کا چرچہ ہوا۔ چنانچہ حکومت نظام کے وزیر سالار جنگ نے' نذیر احمد کو ایک اہم خدمت پر مامور کرنے کی دعوت دی اور نذیر احمد یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڈھ سے رخصت لے کر حیدر آباد روانہ

ہو گئے۔ سر سالار جنگ نے نذیر احمد کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ سلطنت میں بدنظمی کے اسباب کا مطالعہ کریں اور مفصل رپورٹ پیش کریں۔ اس سلسلے میں پہلے نذیر احمد کو دوضلعوں ناگ کرنول اور نلکنڈہ کے دفاتر، کچہری اور مجلس کے معائنہ پر متعین کیا۔ تنخواہ ایک ہزار دو سو چالیس روپئے ماہوار مع بھتہ مقرر ہوئی۔ نذیر احمد نے مذکورہ اضلاع کا دورہ شروع کیا اور باقاعدہ ہر جگہ کی رپورٹ سرکار کو بھیجتے رہے۔ یہ رپورٹیں سر سالار جنگ کو بہت پسند آئیں۔ کچھ اختلاف کے بعد طے پایا کہ نذیر احمد کو ناظم بندوبست کے ساتھ منصرم صدر تعلقدار بنا دیا جائے۔ نذیر احمد کی کارکردگی، لیاقت اور ذہانت سے سر سلار جنگ اس قدر خوش تھے کہ ان کی خواہش پر سر سالار جنگ نے ان کے بیٹے مولوی بشیرالدین احمد کو دوسرے اعزاز سے بھی نوازا۔ نذیر احمد ریاست حیدرآباد میں صدر تعلقدار (کمشنر) کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ریاست میں بدنظمی، مالی حالت کی خرابی، مجلس مال گذاری کے ارکان کے باہمی اختلافات اور دوسرے ناقابل برداشت حالات سے بددل ہو کر نذیر احمد نے اس ملازمت سے بھی استعفیٰ دینے اور پنشن لینے کا فیصلہ کرلیا۔ استعفیٰ دینے کی بعد وہ حیدرآباد سے دہلی آگئے۔ نظام سرکار نے ان کی سرکاری خدمات کے صلے میں ۶۰۰/روپئے ماہوار کی پنشن مقرر کی۔ نذیر احمد اس معاوضہ کے لئے حضرت نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خاں بہادر کے ہمیشہ دل سے مشکور رہے۔

شوخیٔ طبع اور شگفتہ مزاجی

مولوی نذیر احمد میں تیزیٔ طبع کے ساتھ صاف گوئی اور شوخیٔ طبع بلا کی تھی۔ جو کہنا ہوتا وہ کہے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس

بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت تک ہندوستان ترقی نہ کر سکے گا۔ اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر مولوی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس کے چند روز بعد کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انھوں نے بھی اپنے لکچر میں یہی موضوع قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لاٹ صاحب کو شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے۔ اب کیا تھا اللہ دے بندہ لے جو کچھ دل میں بھرا تھا خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے؟ مولوی صاحب شکریہ ادا کرر ہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات۔ مگر انھوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہ رہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثرات کو نہایت پر مذاق پہلو سے بیان کیا۔ فرمانے لگے:

''حضرات پائجامہ اچھا ہے یا پتلون؟ ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پائجامہ کو ہی اچھا کہیں گے مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے' یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم اچکن یا انگر کھے کو اچھا کہیں گے کہ اس سے ستر ڈھکتا ہے۔ آدمی بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے' یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے' یہ کیوں کہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم نرم اور سبک ہوتی ہے۔ ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ

انگریزوں کا ماتحت کیا ہے، ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغ ہدایت ہے۔ اب افعال سے گذر کر اقوال پر نوبت آ گئی ہے۔ لارڈ کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑو اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہم نوا ہوئے یا تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آ گیا ہے کہ پائجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور پتلون کا ولایتی سچ پہن لیا جائے یا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال ولایت سے آیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو اب تمہارے سچ کی قدر نہیں رہی۔ خدا کے لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو یہ بڑے لوگ ہیں، مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم ہنس کر ٹال گئے۔ لاٹ صاحب کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کے محتاج ہو جاؤ گے کیوں کہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو اسی سے تمہارے دلدر دور ہوں گے۔" [1]

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کس قدر صاف گو تھے۔

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص: ۷۳

شخصیت وسیرت

مولوی نذیر احمد اُردو کے بہت مشہور مصنف ہیں۔ان کی کتابوں میں ''مراۃ العروس''، ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' نے بہت شہرت پائی اور یہ مختلف درجوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ان کتابوں کو پڑھ کر مولوی صاحب کی خوبیاں اور خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوجاتی ہیں۔وہ عربی کے عالم تھے مگر اُردو کے مزاج شناس تھے اور بامحاورہ زبان لکھنے کا ڈھنگ ان کو خوب آتا تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماجی اور اخلاقی برائیوں کے بہت خلاف تھے۔

ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود سرکاری نوکری کرتے رہے مگر ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ عام مسلمان خاص کر نوجوان صنعت اور تجارت میں دل لگائیں۔اس کے لئے ہمیشہ بطور قرض مال دینے کو بھی تیار رہتے تھے۔تجارت کے وہ اس قدر قائل تھے کہ اکثر کہا کرتے تھے ''جب کوئی قوم زوال کے اثرات کا شکار ہوجاتی ہے اور خرابیوں کے علاوہ ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ آدمی صنعت وتجارت کو کم رتبہ کا کام سمجھتا ہے، محنت اور مشقت سے جی چراتا ہے اور ساری توجہ اس پر لگی رہتی ہے کہ سرکاری نوکری مل جائے وہ چپراسی کی ہو یا کلرک کی۔باپ دادا کا نام لے کر خاندانی بڑائی کا بکھان کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کہنے والے کا حال کیا ہے؟اس میں کیا صلاحیت ہے اور خوبیاں ہیں؟

مولوی ڈپٹی نذیر احمد ایک بے باک شخصیت کے مالک تھے چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی مشہور کتاب ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی'' میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ لاٹ پادری صاحب کالج میں آئے اور اپنے لکچر میں اس بات پر زور دیا کہ

ہندوستانیوں کو یورپ والوں کی طرح سچ بولنا چاہئے۔ ڈپٹی نذیر احمد سنتے رہے کڑھتے رہے، آخر کار جب شکریہ کا موقع آیا تو انھوں نے لاٹ پادری سے مخاطب ہو کر کہا:

''لاٹ صاحب نے سچ بولنے کا مشورہ تو دے دیا لیکن یہ نہیں کہا کہ ہندوستان والوں کو صنعت و تجارت میں حصہ لینا چاہئے خرابیاں اسی سے دور ہوں گی اور قومی خوشحالی اس طرح آ سکے گی۔'' [1]

اس زمانے میں کسی انگریز کے منھ پر اس طرح بات کہہ دینا اس پر اعتراض کرنا بہت مشکل تھا۔

وہ عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے اور رسم و رواج کی خرابیوں کو سماج کے لئے بہت زیادہ تباہی پھیلانے والی چیز سمجھتے تھے۔ اصل میں یہ سرسید احمد خاں کا اثر تھا۔ وہ سرسید کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ سرسید نے مسلم معاشرے کی خرابیوں کو خوب سمجھ لیا تھا اور آنے والے زمانے کے مسائل کا ان کو خوب اندازہ تھا۔ ہاں دونوں میں ایک فرق ضرور تھا کہ سرسید جس قدر انگریزوں سے قریب تھے اور انگریزی خیالات کو جس قدر اہمیت دیتے تھے مولوی نذیر احمد انگریزوں کی کچھ خوبیوں کے قائل ہونے کے باوجود ذہنی طور پر ان سے اس قدر قریب نہیں تھے۔ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں تھے۔ ہاں مغربی تعلیم اور مغرب کی سائنسی ایجادات کے قائل تھے اور ان سے متاثر تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا۔ وہ چھوٹے درجے سے بڑے درجے پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھے اور دنیا کا وسیع اکھاڑا۔

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص: ۳۷

وہ اپنے دست و بازو کے بھروسے پر اس میدان میں اترے۔ ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت اور ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بآسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ اپنے شاگردوں سے "I am self made man." کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرمایا کرتے کہ بیٹا جو کرنا ہے خود کرو باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے۔ جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کو نا اہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہیں اسی طرح سے غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں۔ یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اخلاقی سبق سے بے خبری۔ لیکن مولوی نذیر احمد اپنے آبا و اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ:

> "میاں اگر لیفٹیننٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپے کے اہل کار رہو، باپ کو لیفٹیننٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔" [1]

ڈپٹی نذیر احمد صاحب بڑے خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھاتے تھے۔

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی ——— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص:۲۲

ناشتے میں دو نیم برشٹ انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوے کا بڑا شوق تھا ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوے کا ہونا لازم تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے تصنیف کا کام جالون سے شروع کیا تھا۔ ان کے بچے اب اس لائق ہو گئے تھے کہ انھیں مکتب میں داخل کیا جائے لیکن ان کا ذاتی تجربہ مکتبوں کی تعلیم اور نصاب سے متعلق خاصا تھا اور وہ مروجہ تعلیم اور درسی کتب کو ناقص خیال کرتے تھے چنانچہ انھوں نے خود اس بات کی کوشش کی کہ اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں لکھیں کہ وہ شوق اور دلچسپی سے انھیں پڑھیں اور جن کے ذریعہ اپنے بچوں کی اخلاقی حالت سدھرے اور معلومات عامہ میں بھی اضافہ ہو۔ 'مراۃ العروس' اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے جو جالون ضلع میں ہی تصنیف فرمائی اس کے علاوہ مسلسل ہی تصنیف کے کام میں مصروف رہے۔

نذیر احمد نے نثری کارناموں کے علاوہ نظموں کا مجموعہ 'نظم بے نظیر' کے نام سے چھوڑا ہے۔ ان کی نظموں کے بیشتر موضوعات قومی، ملکی، اخلاقی اور مذہبی ہیں۔ ان کی شاعری مبالغے اور پراگندہ خیالی سے پاک ہے۔ نذیر احمد کا خیال تھا کہ:

> ''ایشیائی اردو کی شاعری، مذموم ہے اس نے قوم کے اخلاق پر بہت برا اثر کیا ہے۔ شاعری جو خود کمبداء ان تمام خیالات فاسد کا ہے اس کے اثر بد سے کب محفوظ رہ سکتا ہے اس محل پر شاعروں کے دوسرے عیوب بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر میں کم سے کم خود پسندی کا عیب تو ضرور ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ہم پیشوں سے حسد کرنے لگتا ہے جس کو اُم الزمائم کہنا چاہئے اور اگر توقع کے بعد اس کو داد یا صلہ نہ ملے تو وہ ہجو سے لوگوں کی دل آزادی کرتا ہے۔'' [1]

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص: ۲۲

یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد خود کو شاعر نہیں کہتے۔

میں کہاں اور شاعری کا مشغلہ بے سود محض
یہ وہ کرتا ہے جو محفل سے ہو خواہاں داد کا

ڈپٹی نذیر احمد کو ان کی علمی، ادبی اور سرکاری خدمات کے صلے میں سب سے پہلے گورنمنٹ برطانیہ نے ۲۲ر جولائی ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔ اس کے بعد ۲ر اپریل ۱۹۰۲ء کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی سند ایڈنبرا یونیورسٹی سے ملی اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ۳۵ویں کانووکیشن میں چانسلر صاحب (لیفٹیننٹ گورنر پنجاب) نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری عطا فرمائی۔ غرضیکہ نذیر احمد نے جس طرح اپنی زندگی کی ابتدا کی اور اسے جس طرح منتہائے کمال تک پہنچایا اس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

تصنیفات وتالیفات

ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات وتالیفات متعدد اور مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں جیسا کہ وہ اپنی تصنیفات وتالیفات کے بارے میں بذات خود لکھتے ہیں:

''میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں لکھنا چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں .... ڈھونڈھا، تلاش کیا کہیں پتہ نہ لگا۔ میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانا شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے 'مرأۃ العروس'، چھوٹی کے لئے 'منتخب الحکایات'، بشیر کے لئے 'چند پند'۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں' نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیئے مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جس کو

ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک
متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشت لکھ دیا کرتا۔
یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔" [1]

علاوہ ازیں نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت و اشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں، وہ بھی عجیب اتفاق اور پر لطف واقعہ ہے یعنی ڈپٹی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے کہیں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لڑکے سے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو۔ بشیر الدین نے مذکورہ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اُردو میں ان ناموں کی تو کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا یہ کتابیں ابّا نے میرے اور آپا کے لئے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور 'مرأۃ العروس'، 'منتخب الحکایات' اور 'چند پند' کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور 'مرأۃ العروس' کو بہت پسند کیا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ اس پر ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈپٹی صاحب کی تصانیف و تالیفات حسب ذیل ہیں:

<u>۱- ناول</u>

(۱) مرأۃ العروس، مطبوعہ ۱۸۶۹ء

(۲) بنات النعش (مرأۃ العروس کا دوسرا حصہ)، مطبوعہ ۱۸۷۳ئ' جس میں لڑکیوں کی دستکاری اور عملی زندگی کی ترغیب دی ہے۔

(۳) توبۃ النصوح، مطبوعہ ۱۸۷۷ء جس میں سچی اسلامی زندگی کی تعلیم

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی —— مرزا فرحت بیگ دہلوی ص:۲۲

ہے۔اس پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

(۴) محصنات یا فسانہ مبتلا، مطبوعہ ۱۸۸۵ء یہ اسلامی اصلاحی مشن کے تحت لکھی گئی۔

(۵) ابن الوقت (غدر کے زمانے کا قصہ)، مطبوعہ ۱۸۸۸ء انگریزی اور ہندوستانی واسلامی معاشرت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

(۶) رویائے صادقہ، دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

(۷) ایامی، جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت وفوائد بیان کئے ہیں۔

۲- اخلاق

(۱) منتخب الحکایات

(۲) چند پند

(۳) موعظہ حسنہ

۳- مذہب

(۱) ترجمۂ قرآن، نذیر احمد نے قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

(۲) الحقوق والفرائض (۳ر حصے) ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

(۳) الاجتہاد (عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت) ۱۹۰۸ء (۱۳۳۴ھ) میں لکھی۔

(۴) امہات الامۃ (ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات)

(۵) ادعیۃ القرآن (اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں ایک جا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں)

۴- منطق

علم منطق پر یہ کتاب نذیر احمد نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لے کر تصنیف کی ہے۔

(۱) مبادی الحکمت (مصنفہ ۱۸۷۱ء: ۱۲۸۸ھ)، اس رسالے میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے جو منطق کی مروجہ کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۵- علم ہیئت

ڈپٹی نذیر احمد کی یہ کتاب علم ہیئت پر بڑی اہم تصور کی جاتی ہے۔

(۱) سمٰوات (۱۸۷۶ء: ۱۲۹۳ھ)، یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔

۶- قواعد

(۱) مایغنیک فی الصرف

(۲) صرف صغیر (عربی قواعد کے متعلق لکھیں)

۷- متفرقات

(۱) رسم الخط

(۲) نصاب خسرو

(۳) فسانۂ غدر

(۴) مجموعہ لکچر
(۵) نظم بے نظیر نذیر (نظموں کا مجموعہ)
(٦) مطالب القرآن (آخر عمر میں مطالب القرآن کے نام سے ایک ضخیم تصنیف کا آغاز کیا لیکن تمام نہ کر سکے۔)

قانونی کتابوں کے ترجمے اس کے علاوہ ہیں۔

وفات

نذیر احمد نے ۲۷/اپریل ۱۹۱۲ء کو بعارضۂ فالج دہلی میں وفات پائی اور قبرستان باقی باللہ میں مدفون ہوئے۔[1]

□□□□

---

[1] یہ جگہ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے نزدیک نبی کریم سے متصل ہے اس قبرستان میں اولیاء کرام کے علاوہ بہت سے بزرگان دین مدفون ہیں۔

باب دوم

ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی تحریک اور علی گڑھ تحریک

سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک صرف علمی اور تہذیبی تحریک نہیں تھی بلکہ یہ ایک اخلاقی اور اصلاحی تحریک بھی تھی۔ سرسید کی یہی اخلاقی اور اصلاحی تحریک اس دور کے بڑے بڑے دانشوروں اور انشا پردازوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اسی تحریک سے متاثر ہوکر اپنے اصلاحی مشن کو آگے بڑھایا اور اپنی تخلیقات میں قوم وملت کے افراد کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ قومی اصلاح کے سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد کی دانشوارانہ کوششوں اور کارناموں کو سراہتے ہوئے سید افتخار عالم بلگرامی (مصنف حیات النذیر) تحریر فرماتے ہیں:

> ''وہ (نذیر احمد) کبھی امور خانہ داری میں 'مراۃ العروس' کبھی جنس لطیف کے لئے دلچسپ معلومات بہم پہنچانے میں 'بنات النعش' کبھی خداپرستی اور اصلاح خاندان میں 'توبتہ النصوح' کبھی الجھی ہوئی باتوں کو سلجھانے میں 'مبادی الحکمۃ' کبھی علم ہیئت میں 'سمٰوات' کبھی صرف عربی میں 'صرف صغیر' کبھی احکام شرعی کے خلاف کثرت ازدواج کے نتائج میں 'محصنات' کبھی مرصع نذیری میں 'ابن الوقت' کبھی تطبیق خطرۃ الاسلام میں 'رویائے صادقہ' کبھی قواعد املا میں 'رسم الخط' کبھی میاں بشیر کی تعلیم و تربیت میں 'موعظ حسنہ' کبھی مرثیہ قوم میں 'اتمام حجت' کبھی شریعت اسلامی اور فرائض اسلامی اور دستور العمل زندگی میں 'الحقوق والفرائض' کبھی مقدس

اسلام کے معتقدات اور اصول اعمال کی دلائل عقلیہ وشواہد مسلمہ میں 'اجتہاد' کبھی ازالۂ اعتراض تعداد ازدواج آنحضرت میں 'منصف امہات الامۃ' کبھی ترغیب وتشویش وتحریص قرآنی میں 'ترجمۃ القرآن' کبھی تفسیر وتوضیح فرقان مجید میں 'مطالب قرآن' کبھی طلاقت لسانی اور فصاحت و بلاغت اور اُردو لٹریچر میں 'مجموعہ لکچر' کبھی سحر البیانی میں 'مجموعہ نظم بے نظیر' کبھی متعصب مولویوں کے کفر کے فتوؤں سے نہ ڈر کر تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں سرسید کے دوست و بازو، کبھی انگریزی تعلیم وترغیب میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز لکچرار، کبھی مواعظ و پند دینی میں انجمن حمایت الاسلام کے مقدس واعظ، کبھی اجرائے طب یونانی کے لئے مدرسہ طبیہ میں حاذق الملک، کبھی سرسید کے خطاب کو صحیح ثابت کرنے میں زندہ دلان پنجاب کے سرتاج، کبھی لطیفہ سنجی میں ایک زندہ دل، کبھی استعمال اشیا اور طرز معاشرت میں سودیشی، کبھی دولت کے مصرف صحیح میں 'کلوا واشربوا ولاتسرفوا'، کبھی امداد مدرستہ العلوم میں 'اسٹریچی ہال اور بورڈنگ کے کتبے' کبھی ادب انگریزی میں اپنی علمی وادبی بصیرتوں اور اصلاحی مشن کو بروئے کار لائے ہیں۔'' [1]

واقعہ یہ ہے کہ سرسید کی قومی اصلاح سے متعلق کوششیں، تعلیمی اور ثقافتی افکار اور علمی وادبی کارنامے ہماری حیات کے حالات اور خیالات پر کم وبیش ایک صدی سے اثر انداز ہیں۔ سرسید کی تعلیمی اصلاح تحریک یا جدوجہد اور اس کے محرکات کو گذشتہ دو سال کے مذہبی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سرسید ایک مخصوص حالات کی پیداوار تھے۔ دنیا کے دوسرے اصلاح پسند عالموں اور

---

[1] بحوالہ نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعے) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۵۳

مفکروں کی طرح ان کے افکار اور ذہنی رجحانات و میلانات کا ارتقاء بھی بتدریج ہوا تھا۔ سرسید ابتدا میں قدامت پسند تھے لیکن سرسید کی یہ ابتدائی قدامت پسندی، ان کی والہانہ علمی شغف، گونا گوں مشاہدوں، نئے نئے تجربوں اور اصلاحی جذبوں کے ساتھ اور سہارے سے مسلسل روشن خیالی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

سرسید کی زندگی کا سب سے اہم پہلو اور زندگی کا سب سے بڑا مقصد ''تعلیم'' ہی تھا اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلامی سماج میں طریقہ تعلیم ہی ایک ایسا مسئلہ تھا جو اسلام کے عروج اور بعد میں مسلمانوں کے زوال کا باعث بھی ہوا سرسید کا یہ خیال بجا طور پر درست تھا کہ اسلام نے تعلیم حاصل کرنے اور تسخیر کائنات کے سلسلے میں خصوصی توجہ دلائی ہے اور اہل اسلام کو عقلی بنیادوں پر سوچنے کی جانب راغب کیا ہے نیز ان امور پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں بار بار تلقین کی گئی ہے اس لئے کہ ''تسخیر'' کائنات یا کائنات کے پوشیدہ رازوں کے بغیر علوم وفنون حاصل کئے دریافت کرنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں نے جب تک علوم وفنون کے حصول کی جانب توجہ رکھی اور تعلیمات پر عامل ہے اس وقت تک اسلام معاشرتی ترقی کی جانب گامزن رہا۔ اس طرح نویں صدی عیسوی سے لے کر گیارہویں صدی تک انھوں نے علم وفضل اور تحقیق و تدریس میں خاصی ترقی کی باکمال لوگ بھی پیدا ہوئے۔

جب تک مسلمانوں علوم وفنون اور صفت و حرفت میں ترقی کرتے رہے، ان کی سماجی اقتصادی اور ثقافتی لحاظ سے ترقی ہوتی رہی۔ لیکن جیسے جیسے علوم وفنون میں تنزل شروع ہوا ویسے ویسے اسلامی معاشرہ انحطاط پذیر ہوتا گیا اور بالآخر ۱۸ ویں، ۱۹ ویں صدی عیسوی تک یہ معاشرہ اس قدر کمزور اور لاغر ہوگیا کہ مغربی اقوام جو اس وقت اہل اسلام سے ہر طرح سے قوی ہو چکی

تھیں حملہ آور ہوئیں اور اسلامی معاشرہ ان کے حملوں سے شکست پر شکست کھا کر بکھر گیا اس طرح تعلیمی اور تحقیقی بے مائیگی ہی اسلامی معاشرے میں تنزل کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوئی۔ جیسا کہ اشفاق محمد خاں لکھتے ہیں:

> ''ایک مدت تک مسلمان کے نزدیک علم سے محض مذہبی علوم مراد لئے جاتے رہے جب قرآن مجید کی آیات کی تفسیر وتشریح کی ضرورت پڑی تو علم تفسیر مدون ہوا۔ جب النظائر و امثال کی ضرورت محسوس ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے سوانح حیات اور ان کے اقوال مرتب کئے جانے لگے اور علم حدیث کا فروغ ہوا۔ جب اسلام عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں تک پہنچا اور مختلف فلسفوں اور عقائد کے مطابق اسلام کی منطقی اور فلسفیانہ توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو علم کلام کی ابتدا ہوئی۔ جب احکام قرآنی کو اسلامی قانون کی بنیاد قرار دیا گیا تو قرآن کو قانون کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی گئی اور علم فقہ کا وجود ہوا اس طرح قرآن کو صحت تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت سے علم تجوید وقرأت پیدا ہوا اس کے معنی کو صحت کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت سے علم صرف ونحو کی طرف توجہ کی جانے لگی۔'' [1]

غرض کہ بارہویں، تیرھویں صدی کے بعد تعلیم وتدریس ایک طرح سے روایتی اور رسمی ہو کر رہ گئے تھے۔ اسلام کے عروج یا ابتدائی زمانے کے علماء اور فقہاء کی کتابوں کا درس اسی زمانے کے لحاظ سے دیا جاتا تھا۔ علماء دین نے مختلف مروجہ مضامین پر جو کتب تصنیف فرمائی تھیں انھیں کا درس صدیوں تک دیا جاتا رہا اور ان پر کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان ہی تصانیف کی شرحیں ضرور لکھی گئیں اور آئندہ ان شرحوں کی شرحیں بھی لکھی جاتی رہیں مگر نئے تحقیقی مسائل پر غور

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۳۷

وخوض یا نئے نظریات وخیالات کی روشنی میں تحقیقی تجربے کرنے سے قاصر رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ علماء محض زبان ولغت اور صرفی ونحوی کی بحث وتکرار میں الجھ کر رہ گئے۔

اسلامی معاشرے کے برعکس ۱۴ ویں اور ۱۵ ویں صدی سے اہل یورپ علم وفن میں برابر ترقی کرتے رہے جس کے نتیجے میں تجارت اور ہنر میں وہ دوسری اقوام اور ممالک سے بہت آگے نکل گئے اور اسلامی معاشرہ جاگیرداری کا معاشرہ بن چکا تھا۔ یہاں یورپ کی طرح اب کسی قسم کے انقلاب کی کوئی اور ضرورت باقی نہیں رہی تھی البتہ اگر مسلمان اپنے علوم وفنون اور سائنس کی ترقی کو برابر جاری رکھتے اور صنعت وحرفت کے معیار کا سلسلہ بھی قائم رکھتے تو یہ بات ممکن تھی کہ یورپ کی طرح سیاسی وصنعتی انقلاب مشرق میں ظاہر ہوتا اور دنیائے اسلام، اہل یورپ کے سیاسی چیرہ دستیوں اور تسلط سے محفوظ رہتی۔ مگر ہوا یہ کہ مغربی اقوام اپنی عقل ودانش اور علم ہنر کے بل بوتے پر روز افزوں ترقی کر کے ۱۸ ویں صدی تک دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پسند قوم شمار کی جانے لگیں۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اپنا سیاسی جال اس طرح پھیلانا شروع کیا کہ مسلمان رہنماؤں کو اپنے زوال کا شدید احساس ہونے لگا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھا اور اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوگئی اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ناکام ہو چکی تھی اور برطانوی سامراج اپنا تسلط قائم کر چکا تھا۔

ان سیاسی حالات وانقلابات اور مسلسل برطانوی عروج کے پس منظر میں اسلامی مفکرین اور مصلحین کو خواب غفلت سے بیدار ہونا پڑا اور اپنے معاشرے کے تنزل اور انحطاط کے اسباب پر غور وفکر کرنے نیز سیاسی وسماجی اور مذہبی وجود کو برقرار رکھنے کی جانب راغب ہونا پڑا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے ۱۸ ویں صدی کے نصف میں ایک تحریک شروع کی تھی۔

شیخ کی اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان جو اسلام کی اصل تعلیم اور روح کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں انھیں از سرِ نو ان کے دلوں میں تازہ کیا جائے اور وہ تمام غیر اسلامی رسم و روایات، بدعات، قبر پرستی وغیرہ جس کا اصل مذہب سے کوئی علاقہ نہیں ہے مرض کو مسلمانوں نے اپنے مذہب کا جز و لاینفک بنالیا ہے' ان سے نجات دلائی جائے اور قرآن و حدیث کے راستے پر عمل کیا جائے۔

شیخ نجدی کی اس تحریک پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے یہاں تک کہ عرب حکمرانوں نے بھی شیخ کی تحریک کی تائید نہ کی۔ مگر آلِ سعود کے بزرگوں نے شیخ نجدی کی سرپرستی کی اور اہلِ عرب کی اصلاح میں یہ تحریک معاون ثابت ہوئی۔ اس کے اثر سے بہت سے رسم و رواج جو پہلے سے رائج تھے سب ختم کر دیے گئے۔ لیکن چونکہ یہ تحریک ایک مذہبی اجتہاد کا درجہ رکھتی تھی اس لیے اس کا اثر مسلمانوں کی ثقافتی، سیاسی اور عملی مسائل پر قطعی نہیں پڑا اور مسلم سلطنتیں اب تک مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت سے بے بہرہ تھیں۔ اسی طرح اسلامی مفکرین، مجتہدین اور مصلحین کا دائرہ بھی دین کی اصلاح اور اجتہاد تک محدود تھا۔ یہ تحریک محض مذہبی اصلاح، اجتہاد اور انسانی تزکیۂ نفس کی خواہاں تھی جو کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئی یعنی جہاں تک دینی اور مذہبی مسائل کا تعلق تھا ان میں ضرور اصلاح کی راہیں نکلیں اور کچھ روشن خیال لوگ بھی پیدا ہو گئے مگر وہ مسلمانوں کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور علمی وہ تہذیبی مسائل کی اصلاح اور ترقی کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔ اس وقت مغربی اقوام کا پوری طرح تسلط بھی نہیں ہوا تھا نیز سلطنت مغلیہ اور عثمانیہ میں بھی کسی حد تک جان باقی تھی۔ مسلم سلطنتیں اب تک مغربی علوم و فنون اور تہذب و ثقافت سے بالکل بے بہرہ تھیں۔ اس طرح اسلامی مفکرین، مجتہدین اور مصلحین کا دائرہ بھی دین کی اصلاح اور اجتہاد تک محدود تھا۔[1]

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۳

یہی وہ زمانہ ہے کہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث سے اجتہاد کا علم بلند کیا شاہ ولی اللہ نے شیخ عبدالوہاب نجدی کی طرح محسوس کیا کہ ہندوستان کی مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب مختلف فرقوں میں اپنے اختلافات ہیں چنانچہ انھوں نے قوم کو متحد کرنے کے لئے دین اسلام کو نئے انداز سے پیش کرنے کا کام شروع کیا ان کے افکار میں یقیناً جدت اور بلندی تھی حجۃ اللہ البالغہ ان کا شاہ کار ہے۔ اس میں انھوں نے مذہب کی بنیاد اور اصل روح پر جس کو کہ وہ خود صحیح سمجھتے تھے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کتاب میں مذہبی احکام کے اسرار اور احکام بیان کیے گئے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے غزالی کی طرح شریعت میں تصوف کی راگ الاپی ہے۔ انھوں نے تقلید کی مخالفت کی اور آزادانہ تشریح و توضیح کا اصول پیش کیا۔ ان کا زاویہ نظر زمانہ حال سے ہم آہنگ تھا وہ اسلامی سماج کی اصلاح اور تنظیم جدید کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ شاہ صاحب ایک آزاد مفکر و محدث تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ ۱۹ ویں صدی کی ابتداء میں فرانسیسیوں کے حملے اور عارضی تسلط نے سلطنت عثمانیہ کو سیاسی اور اقتصادی طور پر کمزور کر دیا تھا اور محمد علی پاشا خدیو کی اصلاح کی کوششوں سے معاشرے کی بدحالی دور نہ ہو سکی چنانچہ صنعت و حرفت کے فقدان، تعلیم کی کمی اور غربت و افلاس کی زیادتی مصر کی غلامی کا سبب بن گئی یعنی ۱۸۸۸ء میں اسکندریہ پر انگریزوں نے حملے کر کے اپنا تسلط کا قائم کر لیا۔ مغربی اقوام کی ان فتوحات غیر متوقع پر مسلم مفکرین عالم دین حضرات طرح طرح سے غور و فکر میں مصروف ہو گئے اور نتیجے کے طور پر علماء کرام نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ناکامیوں اور اہل یورپ کے عروج کا سبب علوم و فنون ہنر و تجارت، صنعت و حرفت، سائنس اور فلسفے کی ترقی میں دیکھا سید جمال الدین افغانی اسی دور کے پیداوار تھے لیکن

وہ مذہبی سے زیادہ سیاسی رہنما تھے اوراس میں شک نہیں کہ ان کی باغیانہ سیاسی سرگرمی مصر سے لیکر ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا موصوف انگریزوں کے سخت دشمن تھے وہ ہندوستان میں بھی کئی بار آ چکے تھے ۱۹ ویں صدی کے نصف آخری دہائیوں میں مصر میں اور بھی سیاسی اور مذہبی مصلحین پیدا ہوئے جن میں شیخ عبدہ، رشید رضا، اور مصطفےٰ کمال قابل لحاظ ہیں اور ان سب میں شیخ محمد عبدہ کی حیثیت اور اہمیت بلند تر ہے۔ شیخ صاحب ایک روشن خیال انسان تھے اور سرسیدؒ کی طرح مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کو سب سے زیادہ مقدم فریضہ خیال کرتے تھے۔ انگریزوں کے اقتدار اور تسلط کے بعد محمد عبدہ نے ذہنی اور علمی طور پر مسلمانوں میں مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔ سرسیدؒ اور محمد عبدہ کی اصلاحات میں خاص مشابہت پائی جاتی ہے۔ مصری عوام کی ترقی اور ذہنی طور پر روشن خیال بنانے میں محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کا بڑا حصہ ہے۔ محمد عبدہ کی اصلاحات کا مقصد مذہب اور احکام شرعی میں اجتہاد پیدا کرنا تھا اور جدید علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دیگر اقوام کے برابر پہنچنا تھا۔ مگر ان کے نئے اور جدید تر افکار وخیالات سے علماء کرام کا ایک بڑا گروہ اس وقت بھی اختلاف رکھتا تھا اور شاید آج بھی مخالف ہو۔

مصلح قوم اور ان کی اصلاحی تحریکوں کے اس سرسری بیان سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ سرسید احمد اور ان کی تعلیمی اصلاحی تحریک کے پیچھے گذشتہ ڈیڑھ دوسو سال کی ایک ایسی تاریخ ہے جسے بیک وقت ملکی اور غیر ملکی، سماجی اور سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات، تغیرات اور اصلاحات سے منسلک کیا جا سکتا ہے اور سرسید احمدؒ کے نظری اور علمی رجحانات، رویوں اور کارناموں کا رشتہ ماضی کے اجتہادی اور انقلابی اصلاح پسندوں کی کاوشوں سے جوڑا جا سکتا ہے۔ سرسید احمد کی

نظر اپنے ماضی کی تمام تحریکات اور ان کے محرکات پر اچھی خاصی تھی انھوں نے اپنے بزرگ مصلحین کے کارناموں سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ جب وہ اپنے شعور کی پختگی پر پہنچے تو یہاں بھی قومی مسائل ومصائب کا ایک پہاڑ سامنے کھڑا دیکھا اور اب سرسید کے سامنے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح قومی وجود کی بقا اور ارتقاء کا مسئلہ درپیش تھا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ملکی سیاسیات نے زبان وادب میں رخنے ڈالنے شروع کر دیتے تھے۔ تعلیمی وسماجی انقلاب اور اصلاح کی تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں۔ لارڈ مکالے کی ناعاقبت اندیشی نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بننے سے محروم کر دیا تھا۔ ملکی یا دیسی زبانوں کی جگہ اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی زبان لے رہی تھی۔ میکالے کی اس کوتاہ بینی کی پالیسی سے عرصے تک ہندو اور مسلمان انگریزوں کی اس پالیسی سے برگستہ رہے۔ لیکن یہ اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کو راجا موہن رائے (۱۷۷۴-۱۸۳۳ء) جیسی دوراندیش شخصیت مل گئی۔ راجا صاحب ایک بیدار مغز اور روشن خیال انسان تھے اور اپنی روشن خیالی کی بنا پر ہی مغرب کے نئے تصورات اور علوم فنون کی ترقی پر ایمان رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلی بار ہندوستانیوں کو مغربی علوم سے واقف کرانے اور مذہبی عقائد ومسائل کو عقلی بنیادوں یا معیاروں پر پرکھنے نیز غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر سماج کی تنظیم نو کے لئے ''برہموسماج'' کی نئی بنیاد ڈالی۔ راجا صاحب کی اس تحریک سے ہندوستانی تہذیب وتمدن مذہب ومعاشرت کی راہوں میں ترقی اور انقلاب کے امکانات پیدا ہوئے۔ نئی تعلیم سے مستفید ہونے کے سلسلے میں کلکتہ میں ہندو کالج کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح ہندوؤں میں نئی تعلیم کے اجرا کا چرچا ہوا اور مغربی علوم وفنون سے فیضاب ہونے کی راہیں ان پر کھلیں۔ علاوہ ازیں سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج کی تحریک بھی اسی

سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مسلمان عرصۂ دراز تک نئی تعلیم سے بیزار رہے۔ زمانہ جوں جوں گذرتا گیا یورپ کے تاجروں کا عروج اور تسلط ہوتا گیا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ اچانک لکھنو کے الحاق کا اعلان کر دیا گیا اور جو قصہ گوئی کا مرکز تھا واجد علی شاہ، معزول کئے گئے اور اس کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی چھڑ گئی اور چاروں طرف اس جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اس جنگ کی تباہی اور بربادی کی ایک تاریخ ہے بہر حال بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار سلطنت مغلیہ معزول کئے گئے اور اور رنگون بھیجے گئے اور اب باقاعدہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت اور اقتدار کا اعلان کر دیا گیا دلی اور لکھنو اجڑ گئے۔ [1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یا بغاوت دراصل ایک ایسا سیاسی انقلاب تھی جس نے اقتصادی اور معاشی زندگی کو یکسر بدل ڈالا تھا اس وقت دہلی کے متوسط طبقے کے عوام بالخصوص مسلمان جن کی معاشرت و معیشت کا انحصار شاہی جاگیروں، وظیفوں، ملازمتوں اور عطیوں پر تھا سب سے زیادہ معاشی، اقتصادی، ذہنی اور تہذیبی بحران میں مبتلا ہو گیا تھا یعنی انگریزی تسلط کے بعد ان کی روزی کے حیلے اور زندگی کے وسیلے تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ انگریز حاکموں نے بغاوت کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی تھی۔ مسلمان طرح طرح سے انگریزی اقتدار کے تحت دن بہ دن محتاج و مفلوک الحال ہوتے جاتے رہے تھے دوسری طرف اسلامی شریعت کے خود ساختہ حاملوں کا مسلسل یہ اعلان اور فتویٰ جاری رہا کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم ناجائز اور سرکاری ملازمت حرام ہے۔ غرضیکہ ہندوستانیوں کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۴۲

لئے بالخصوص یہ دور سخت درد و کرب اور آزمائش کا دور تھا۔ بالآخر مسلمانوں کی اس قدر روز افزوں بدحالی اور ناعاقبت اندیشی کا شدید احساس سرسیدؒ کے درمند دل میں پیدا ہوا۔ انھوں نے قومی خطرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا لہٰذا اپنے چند رفقاء کے ساتھ ملکر تعلیمی اور سماجی اصلاح کی تحریک شروع کی یہ اصلاحی تحریک آگے چل کر علی گڈھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ [1]

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور اس کی ناکامی کے برے نتائج نے ان پر یہ بات واضح کردی تھی کہ اب قوم و ملک اس لائق نہیں ہیں کہ وہ سیاسی یا قومی اعتبار سے انگریزوں کا مقابلہ کرسکیں اور نہ ہی وہ اس وقت سو سال بعد کی کوئی پیش گوئی کرسکتے تھے ان کی نظر مستقبل سے زیادہ حال پر مرکوز رہی اور حال کی بہتری کو مستقبل کی عافیت خیال کیا ان کے اسی خیال اور فکر و نظر کا مجموعی تقاضہ صرف یہ تھا کہ اب قوم کو کسی طرح پس ماندگی اور جہالت سے نکالنا ہے، خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے اور اسے اپنی کمزوریوں اور برائیوں کا شدید احساس دلا کر ان سے نجات دلانا ہے۔

سرسیدؒ نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے جو پروگرام بنایا اس پر عمل درآمد کرانے میں انھیں بعض بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شواریاں قومی تعلیم و تہذیب کے مسائل سے متعلق نظریاتی تصادم پر مبنی تھیں یعنی قوم درج ذیل تین گروہوں میں منقسم ہوگئی تھی۔

(۱) پہلا گروں مغربی علوم فنون اور تہذیب و تمدن سے متاثر تھا اور مشرقی و مغربی تمدن کے امتزاج کا حامی تھا۔

(۲) دوسرا گروہ نئی تعلیم اور نئی تہذیب سے متاثر ہونے کے باوجود اپنی مشرقی وضع اور صحت مند مذہبی روایات و احکامات کو کسی قیمت پر ترک کرنے کو تیار نہ تھا۔

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۴۳

(۳) تیسرا گروہ وہ تھا جسے نئی حکومت اور نئی تعلیم وتہذیب کسی بھی حالت میں گوارہ نہ تھی اور تمام معاملات ومسائل کا حل مذہب اور ماضی میں تلاش کرتا تھا۔

سرسیدؒ پہلے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بعض دوسرے رفقاء جن میں نذیر احمد بھی شامل ہیں۔ دوسرے گروہ سے متعلق تھے نقطۂ نظر کے فرق کے باوجود دوسرے گروہ کے تمام ساتھیوں اپنے اپنے ڈھنگ سے سرسید کے ساتھ تعلیمی اور اصلاحی کاموں میں جہاد بالقلم سے کام لیا اور ان کا ہاتھ بٹایا اور طرح طرح کی مشکلات کو گوارہ کیا۔

قومی اصلاح کی تحریک میں سرسید کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت اسلام کی نئے انداز اور نئے زاویوں سے تفسیر بیان کی اور ان کو نئے مذہبی طرز فکر کی بنیاد ڈالی۔ تفسیر قرآن لکھ کر مذہب اسلام کی تعلیمات وفلسفہ کی مکمل تعبیر موجودہ عہد کی ضروریات کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا علاوہ ازیں توریت اور انجیل کی تفاسیر بھی اس نقطۂ نگاہ سے لکھی کہ مسلمان اور عیسائی ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آ جائیں اور وہ خود اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ اسلام اور مسیحیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور الہامی کتابوں میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی شکل میں موجود ہے۔ [1]

عرض کہ سرسید احمد خاں نے اپنی ذہانت اور تدبر سے ایک پسماندہ قوم کی مذہبی، تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لئے مسلسل جدوجہد کی اور ان کی کوششیں بلاشبہ کامیاب ثابت ہوئیں۔ سرسید سماجی اصلاح کے کاموں میں ۱۸۷۵ء سے پہلے بھی مصروف رہے تھے لیکن بغاوت کے بعد ان کے دل میں قوم کی تعلیمی، مذہبی اور سماجی اصلاح کا جذبہ شدت سے پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۴۷

اپنی ملازمت جہاں کہیں بھی کر رہے تھے ایک نہ ایک اسکول ضرور کھولتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ایک انگریزی اسکول مرادآباد میں اور ۱۸۶۴ء میں دوسرا اسکول غازیپور میں قائم کیا اور جب قدرے فرصت پائی تو ۱۸۷۵ء میں مولوی سمیع اللہ صاحب کے قائم ہوئے مدرسے سے دلچسپی لینے لگے اور ۱۸۷۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے پر اس مدرسہ کو کالج بنایا جو ۱۸۸۱ء میں ایم۔اے۔او کالج کے نام سے مشہور ہوا اور ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کی خواہش تھی کہ وہ کالج کو یونیورسٹی کی شکل میں دیکھیں۔ اس یونیورسٹی کا خاکہ ان کے ذہن میں موجود تھا مگر ان کی زندگی میں یہ خاکہ عملی شکل اختیار نہ کرسکا۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں ایم۔اے۔او کالج، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

سرسید نے مسلمانوں کی اس تباہی کا راز پالیا اور حکمت عملی اور فکر کی روشنی میں مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام شروع کردیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت ختم ہوگئی ہے اور صرف روحانیت سے مسلمانوں کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں سید احمد بریلویؒ بھی جدوجہد کر رہے تھے اور سرسید احمد خاں روحانی طور پر سید احمد بریلوی سے بہت قریب تھے اور ان کے مرید بھی تھے لیکن ان کی تمام کوششیں جو زندگی بھر وہ کرتے رہے اور ان کے خلفاء بھی برابر کے شریک رہے مگر سب بےکار ثابت ہوئے۔

دوسری طرف سرسید احمد خاں نے انگریز فاتح قوم کی ترقی کا راز پالیا تھا جن کی بنیاد پر وہ ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا انگریز جو ہم ہندوستانیوں پر حکومت کر رہی ہے اور ان کو برتری حاصل ہے اس کی واحد وجہ علوم جدید کا حاصل کرنا تھا۔ انگریز قوم سائنس اور دیگر جدید علم سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ سرسید احمد خاں ہندوستانیوں کو خاص طور پر

مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ ان کا مکمل عقیدہ ہو گیا تھا کہ انگریز قوم کی برتری صرف علوم جدیدہ سے ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مسلمان حکومت کی نظر میں بے اعتباری کا شکار ہو گئے تھے۔ جن کو فوری طور دور کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے ایک کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی جس میں سارا الزام انگریز قوم پر لگایا۔ غدر کی ساری ذمہ داری حکومت پر عائد کی وہ بھی اس حالت میں جب کہ کورٹ مارشل کہ شعلے ہیبت ناک صورت میں ہر طرف بلند ہو رہے تھے۔ اس کتاب کی تصنیف سر سیدؒ کا ایک نہایت ہی جرأت مندانہ قدم تھا۔ [1]

یہ رسالہ (کتاب) نہ صرف مسلمانوں کی ہی بلکہ کل ہندوستان کی سالمیت کا سنگ بنیاد ہے جس پر مکمل سیاست کی تعمیر ہوئی جو کہ سر سیدؒ کی اصلی اور بنیادی پالیسی تھی۔ اس کتاب کا حکومت کے اوپر بیحد اثر ہوا اور مسلمانوں کے تئیں اس کے سخت رویے میں نرمی آئی۔ بنگلوری کے خیال کے مطابق سید احمد بریلوی کی جدو جہد اس سلسلے میں محض بیکار ثابت نہیں ہوئی بلا شبہ سید احمد بریلوی اور ان کے خلفاء کے خلفاء کی جدو جہد (جہاد) کی پالیسی کی وجہ سے اور حکومت کے جابرانہ رویئے کے خلاف ردعمل نے ہی حکومت کو اپنی پالیسی بدل دینے پر مجبور کر دیا۔

سر سید احمد کا یہ خیال اپنی جگہ پر درست تھا کہ مسلمان سائنس وعلوم جدیدہ کی جانکاری کے درمیان ہی ترقی ہی کر سکتے اور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ کے قابل نہیں ہو سکتے مگر حکومت و ارباب حکومت بھی اپنی جگہ سمجھ سکتے تھے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو دبا کر نہیں رکھا جا سکتا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے مذہب میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ خرابی خود ان کے اندر ہے۔

---

[1] بحوالہ موج کوثر ص ۱۰۱

سرسید احمد خاں نے برطانوی حکومت کی برتری و اثرات کو تسلیم کر لیا تھا اگر چہ ہندوستانی ان سے شکست کھا چکے تھے مگر اس شکست کی وجہ سے سرسیدؒ نے ان کی قومیت کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ دوسرے اور بہت سے اسباب تھے جس کی وجہ سے سرسیدؒ نے انگریز قوم کی برتری کو تسلیم کر لیا تھا۔ انگریز قوم کے پاس سب سے خاص چیز جو تھی ان کی علوم جدیدہ سے وابستگی، جس کو سرسیدؒ اپنی قوم کے اندر دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ انتہائی انہماک کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ غازیپور کا مدرسہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا مظہر ہے اسی طرح بنارس میں ملازمت کرتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں ایک بڑی درسگاہ کا خیال پیدا ہوا اسی دوران انھوں نے انگلستان کا سفر کیا، انگلستان کے سفر نے ان کے تعلیمی پروگرام کو اور بھی تقویت بخشا۔ جہاں انھوں نے وہاں کی بڑی بڑی درسگاہوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہاں کے لوگوں کے اندر تعلیم کے حصول کے لئے بہت ہی سرگرمی اور دلچسپی دیکھی وہاں کے اصلاحی پروگرام دیکھے۔ ان سب سے سرسیدؒ بہت ہی متاثر ہوئے اور خاص طور پر ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر جو اصلاحی جریدے تھے سرسید کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔

سرسیدؒ اس زمانے میں انگلستان پہنچے تھے جب ایڈیس اور اسٹیل کے اصلاحی رجحانات کے خلاف یورپ میں ردعمل شروع ہو چکا تھا۔ انگلستان میں اس وقت وکٹوریہ کا زمانہ تھا۔ زندگی کی قدریں بھی انھیں مصلحوں کی اخلاقی قدروں سے میل کھاتی تھیں اس لئے ان کا اثر باقی تھا وہاں صنعتی انقلاب اور مہاجنی نظام اپنا اثر قائم رکھا تھا جس کی وجہ سے زندگی کی قدریں بدل رہی تھی۔ ان میں بحرانی حالات پیدا ہو چکے تھے لیکن ہندوستان اس کے مقابلے میں ابھی بہت پیچھے تھا۔ اس قسم کا انقلاب ایشیا میں قریب ایک سال بعد رونما ہوا۔ اس لئے سرسیدؒ نے اپنی قوم میں اس قسم کے انقلاب کی ضرورت محسوس کی جس کے علمبردار ایڈیس اور اسٹیل تھے۔

سرسید نے ہندوستان پہنچ کر'' تہذیب الاخلاق'' نام کے رسالے کا ۲۴ردسمبر ۱۸۷۰ء میں اجرا کیا جس میں انھوں نے علوم جدیدہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر مشتمل نئے ادبی مضامین شائع کرنا شروع کیے۔ اس رسالے سے سرسیدؒ کے خیالات عام مسلمانوں تک پہنچے اور یہی سرسید احمد خاں کا مقصد ہی تھا۔ اس رسالے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے غیر متحرک اور جدید خیالات کے اندر ایک تحریک پیدا ہو اور وہ بیدار ہوں اور ایک طرح کا انقلاب پیدا ہوا اور ان کو وقت کے لائے ہوئے حالات میں زندہ رہنے کا سلیقہ آ جائے۔ لیکن اس کا ردعمل اس قدر سخت ہوا کہ شاید سرسیدؒ کو بھی اس کا گمان نہیں تھا اس طرح جدی تعلیمی پرگرام کو عملی طور پر شروع کرنے سے پہلے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان کے مخالف ہوگئی اور اس تحریک کو جو بعد میں علی گڈھ تحریک کے نام مشہور ہوگئی تقویت پہنچنے کی جگہ نقصان پہنچا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں علم الکلام کی جو مثالیں ہیں ان کو جدید علم الکلام کے آغاز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سرسید کا ایک عظیم کارنامہ ہے اس کے علمی ادبی، اور مذہبی مضامین کے ایک گرانقدر ذخیرے نے اردو زباں کو ایک افق سے روشناس کرایا ہے اور اس کی وجہ سے اردو نثر نگاری میں بلا کی وسعت پیدا ہوگئی۔

سرسید کے قائم کردہ کالج کی اہمیت اور افادیت کے ان کے مخالف بھی قائل تھے مگر ان کے مذہبی خیالات کے جس کو انھوں نے تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے شروع کے چھ سالوں میں پیش کیے ہیں زبردست مخالفت ہوئی حتیٰ کہ ۱۸۷۷ء میں اس کو بند کر دینا پڑا۔ اس جریدہ کو اس وجہ سے بھی بند کرنا پڑا کہ اس دور کے زمیندار اور اہل ثروت نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت سے باز آجائیں تو ہم ان کے کالج کے لئے بھرپور تعاون دینے کا وعدہ کرتے ہیں اور سرسیدؒ نے بھی محسوس کیا کہ تہذیب الاخلاق شائع کرنے کا جو مقصد تھا وہ اب قریب

قریب پوا ہو چکا ہے مسلمانوں کے اندر جو ایک جمود تھا وہ ایک حد تک ٹوٹ چکا ہے ان لوگوں کے درمیان مذہبی مباحثے شروع ہو چکے ہیں مذہب کی کورانہ تقلیدی جبلت میں ایک طرح انقلاب آ چکا ہے ہر آدمی موافقت یا مخالفت میں مذہب کی بہت سی قدیم مسلم روایات اور رسم و رواج کے تعلق سے ہی سوچنے لگا ہے کہ ان کے منجمد خیالات میں عقل کی لو جل اٹھی ہے لہٰذا تہذیب الاخلاق کے بند کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت کو بند کر دیا۔

تہذیب الاخلاق کا دوبارہ پھر اجرا ہوا مگر پہلے کی طرح اس کی مخالفت نہ ہوئی اس لئے کہ مسلم عوام میں اس طرح کے مذہبی خیالات مانوس ہو چکے تھے دوسرے اب سرسیدؒ اس میں بہت کم مضامین لکھتے تھے اب اس میں ان کے رفقاء کار کے زیادہ مضامین ہوتے تھے۔

اب سرسید احمد خاں زیادہ تر اپنے مذہبی خیالات کا اظہار اپنی تقریروں میں اور تفسیر القرآن کے ذریعہ کرنے لگے تھے۔ سرسیدؒ نے تفسیر القرآن میں معجزات، دعا، وحی، الہام فرشتے وغیرہ کی تاویل اپنے انداز میں کی ہے اس میں سرسید احمد خاں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تمام تر مافوق الفطرت باتوں کی تاویلیں دور جدید کے لئے قابل قبول ہو جائیں اور جدید علوم اور سائنس کی روشنی میں بھی اس سے انکار ممکن نہ ہو سکے انھوں نے ان باتوں کو بھی جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے عقل کی حد سے آگے ان کو ماننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام ایک فطری مذہب ہے اس میں کوئی بھی غیر فطری اور خلاف عقل بات ہوتی نہیں اس لئے ان کو اور ان کے ماننے والوں کو نیچری کہا گیا ہے۔

سرسیدؒ کے لئے محض قرآن ہی بنیادی حیثیت رکھتا تھا حدیث وفقہ کو وہ فروعی چیز سمجھتے تھے اس لئے کہ ان میں شک وشبہ کی گنجائش ہے اور قرآن اپنی جگہ مستند ہے اس میں کسی قسم کے شک

وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی کا گمان بھی ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف عشق رسول بھی حد درجے پر تھا اسی عشق رسول کے جذبے کے تحت خطبات احمدیہ کی تصنیف عمل میں آئی۔ سرسید کو کسی طرح یہ گوارہ نہیں تھا کہ غیر مذہب کے ماننے والے اسلام کے خلاف کچھ لکھ کر نکل جائیں۔ سرسیدؒ کی یہی مناظرانہ ذہنیت زیادہ تر تہذیب الاخلاق کے مقالے کے تحریر کی وجہ بنے۔ اسی لئے تفسیر القرآن لکھنے کی تحریک ہوئی اس نے بھی خطبات احمدیہ لکھنے پر مجبور کیا۔ اسی مذہبی خیالات کے دباؤ کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے جدید مذہبی خیالات کا اظہار شدت کے ساتھ کرنے لگے اور ان کی یہی ہیجانی کیفیت ان کے خواب کی مکمل تعبیر میں رکاوٹ بھی بنی۔ مگر پھر بھی ان کے انھیں جدید مذہبی خیالات سے جدید علم الکلام کی بنیاد پڑی جس سے ان کے رفقاء نے استفادہ کر کے مذہب کے متعلق بہت سے متواتر اور قابل قبول خیالات پیش کئے چنانچہ اشفاق اعظمی اپنی کتاب ''نذیر احمد شخصیت اور کارنامے'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''علامہ شبلی نعمانیؒ کے علم الکلام کی بنیاد سرسید کے انھیں مذہبی خیالات پر ہے شبلی نے بات کرنے کے اپنے نرم انداز اور اپنے دلکش سلیقے سے ان خیالات کو عوام کے لئے قابل قبول بنا دیا جس سے شبلی کی مذہبی تحریروں کی مخالفت نہیں ہوئی۔'' [1]

اگر چہ علامہ شبلی نعمانیؒ تک آتے آتے زمانہ بدل چکا تھا جبکہ سرسیدؒ نے جس وقت اس کام کو اپنے ہاتھوں لیا تھا وہ دوسرا ہی زمانہ تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی کے مطابق گھر میں آگ لگی تھی، ہیبت ناک شعلے اٹھ رہے تھے ان کو بجھانا مقدم تھا۔ سرسیدؒ کو ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ لوگوں کو بلانے کے لئے لہجہ کو درست کرتے آواز میں دلکشی پیدا کرتے' وہ تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بلا رہے

---

[1] نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، اشفاق محمد خاں ص ۴۸

تھے۔ان کا یہی رجحان اور طرح طرح سے لوگوں کو اپنی طرف بلانا ہی ان کا طرز بن گیا لیکن ان کی آواز کو تراش خراش کرنے کا موقع ان کے رفقاء کو ملا جس کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے شعر و ادب میں انقلاب پیدا کر کے عوام کو اس بدلے ہوئے دور کا احساس دلایا اور سرسیدؒ کے تنقیدی شعور اور اس دور کے چند نقادوں کے خیالات کو معلوم کر کے جدید تنقید کی بنیاد ڈالی۔حالیؔ اور شبلیؔ نے سرسید صاحب سے استفادہ کر کے سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی چنانچہ سرسیدؒ کے شریک کاروں نے اپنی بے پناہ محنت اور کاوشوں سے مخالفین کا منھ بند کر دیا اور علی گڈھ تحریک کو عوام کے لئے قابل قبول بنا دیا نواب محسن الملک اور وقار الملک نے سرسید گرد احاط کر لیا اور ان پر ہونے والے حملوں کو نہایت ہمت اور بہادری سے روکا۔محسن الملک نے سرسید کی شدت پسندی کو کم کیا اور ان کے خیالات کی عام فہم تاویلات عوام کے لئے قابل قبول اور قابل فہم بنا دیا۔دونوں نے سرسید کے خوابوں کی حفاظت ان کے بعد بھی کی۔

مندرجہ بالا بزرگوں (نواب محسن الملک، نواب وقار الملک) کو بھی سرسیدؒ سے بعض امور میں اختلاف تھا۔''حیات وقار'' میں اختلاف کی تفصیل دی گئی ہے لیکن سرسید کی نیت کے خلوص پر علامہ شبلی نعمانیؔ کا بھی ایمان تھا اور ان کی قومی خدمت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔علامہ شبلی نے ندوۃ العلوم کو ایم۔او کالج علی گڈھ کے مدمقابل لکھنؤ (ندوہ) میں سرسید کے چند خیالات اور نظریات کے اختلاف میں ہی قائم کیا۔ اگر ان بزرگوں کسی طرح مصالحت ہو جاتی تو مدرسۃ العلوم، ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہوتیں اور آپس میں ملکر گراں قدر قومی خدمت انجام پذیر ہوتی۔ [1]

---

[1] نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، اشفاق محمد خاں اعظمی ص ۴۹

سرسید کو اردو زبان کی ترقی اور اپنے قدیم تاریخی سرمائے کے تحفظ کا ہمیشہ ہی خیال رہا۔ انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' اور دوسرے اخبارات کے ذریعہ مختلف موضوعات پر مدلل مضامین لکھ کر ذہنی اصلاح کی کوششوں کے ساتھ اُردو زبان کی سادگی اور صفائی پر زور دیا۔ سرسید احمدؒ ۱۹ ویں صدی کے ہندوستان کی برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے تعلیم، مذہب، سماجی اصلاح اور زبان وادب میں نمایاں مرتبہ حاصل کیا۔

سرسیدؒ کی تعلیم اور صلاحی تحریک میں جن بزرگوں نے عملی طور پر حصہ لیا ان میں مولوی چراغ علی، مولوی سید احمد، سید مہدی علی، محسن الملک، الطاف حسین حالیؔ، علامہ شبلی نعمانیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی مشتاق حسین، وقارالملک، مولوی زین العابدین کے اسمائے گرامی سرفہرست آتے ہیں۔ سرسیدؒ کے ان رفیقوں میں ڈپٹی نذیر احمد ایک منفرد شخصیت کے حامل ہیں۔

سرسیدؒ کی تعلیمی اصلاحی تحریک میں مولانا نذیر احمد نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ وہ سرسیدؒ کے داہنا ہاتھ تھے۔ نذیر احمد بلاشبہ اپنے عقائد ونظریات پر سختی سے کاربند تھے اور کہنے کو قدیم یا کٹر مولوی بھی مگر ان کی نیت بخیر تھی۔ ان کا ایمان تازہ اور سینہ کشادہ تھا۔ وہ صاحب علم وسیرت تھے اس لئے وہ مہذب قوموں کے اوصاف اور جدید تہذیب کے تقاضوں سے بھی آشنا تھے۔ ایک لکچر میں انھوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم کو دنیاوی فلاح وبہبود کا سبب بتایا ہے اور مسلمانوں کو سائنسی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی تحریک

اس میں شک نہیں کہ سرسیدؒ کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں جن بزرگوں نے عملی طور پر حصہ لیا ان میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان کی وابستگی سرسیدؒ کے لیے بڑا سہارا تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد کو سر سیدؒ کی اصلاحی تحریک کے لیے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی تھا لیکن نہایت وسیع القلب تھے۔ اور انھوں نے نقطۂ نظر کے فرق کے باوجود اپنے ڈھنگ سے سر سیدؒ کی اصلاحی تحریک میں جہاد بالقلم سے کام لے کر زمانے کی سختیوں اور صعوبتوں کو اپنے لیے آسان بنا دیا۔

سر سیدؒ کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں مولانا نذیر احمد نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ وہ سر سیدؒ کا داہنا ہاتھ تھے۔ وہ صاحب علم سیرت تھے اور صاحب بصیرت تھی۔ اس لیے وہ مہذب قوموں کے اوصاف اور جدید تہذیب کے تقاضوں سے بھی آشنا تھے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے بغیر وہ کسی بھی معاشرے کو متقبول و مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ درج ذیل ایک لکچر میں انھوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم کو دنیاوی فلاح و بہبود کا سبب بتایا ہے اور مسلمانوں کو سائنسی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ فرماتے ہیں:

''...... میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض و غائت کیا ہے...... پس تعلیم کے مفید و مامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسائش، انسان کی عافیت تعلیم کی دوشاخیں ہوگئیں۔

جو تعلیم انسان کے قوائد عقلی کو ڈیولپ (Develop) کرے اس کو اہم دنیاوی تعلیم کہیں گے اور تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے اس کو دینی۔

یہ امر داخل بدہیت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل اور اسٹیمر اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشین ان ہی زوروں کے آثار ہیں۔ وہ چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا خدا علیم ہے کہ ان کا کنسرکشن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ذھن ہوں گے جنھوں نے ان

کو ایجاد کیا ہوگا۔'' [1]

''اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب وہوا تو ہی ہے جو پہلے تھی لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سے ملک میں جن کی آب و ہوا یورپ کے آب وہوا سے ملتی جلتی ہے اور وہاں کے باشندے کندہ تراش ہیں۔ ہونہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دی جا رہی ہے اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اس کی ابجد نیٹوز (Natives) کو پڑھانا شروع کی ہے۔ ''فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ'' یعنی لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لایا اور کوئی اس سے بھٹک رہا۔

صدعنہ میں کم نصیب، بدقسمت، بدبخت مسلمان ہیں جو اب تک اس جدید تعلیم کی طرف پس وپیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ دنیاوی بہبود وفلاح تو بدوں سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں۔ اگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے رہو۔ آگے اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو، جھڑکیاں سنو، جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا سنیتا ہو چکے تو بھیک مانگو۔ مگر میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر ڈوب مرو۔''

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۵۰

اس طویل اقتباس سے نذیر احمد کے نظریۂ تعلیم و ترقی وخصوصاً سائنسی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ نذیر احمد دنیاوی فلاح و بہبود اور قوائے عقلی کے نشو ونما کے لئے سائنس کی تعلیم کے حصول پر زور دیتے ہیں۔ وہ اس جدید تعلیم کا مذہبی عقائد کے ساتھ تصادم بھی نہیں بتاتے لیکن سائنس کے کرشموں اور ایجادات کو سراہنے کے باوجود انسانی عقل کی نارسائی پر ان کا ایمان ہے اور وہ ہر موجد کو کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہی سمجھتے ہیں اور ان کا عقل کل ہونا یا خدا بننا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ وہ موت پر آدمی کا قابو پانا کسی طرح بھی تصور نہیں کرسکتے اور جب یہ بات ممکن نہیں تو وہ اس عارضی زندگی میں حیات بعد الموت پر زور دیتے ہیں اور زندگی کو اعتدال اور سلیقے سے گذارنے کا درس دیتے ہیں۔ البتہ جب بھی وہ ہمیں نصیحت فرماتے ہیں اور موت کے اٹل ہونے کی بار بار یاد دلاتے ہیں تو بلاشبہ کچھ دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ساری جدو جہد اور تعمیر و تخلیق بے کار محض ہے۔ مگر غور کیجیے تو موت واقعی ایک بڑی حقیقت ہے یعنی خدا کے وجود اور رسول کی رسالت سے کوئی فرد منکر ہوسکتا ہے؟ مگر موت کے اٹل ہونے کے اقرار سے کسی کو نجات نہیں۔ اس طرح نذیر احمد انسان کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ موت کی یاد دہانی سمجھتے ہیں۔ یہ تصور آدمی کو فساد، حرص و آزار اور دوسری ترغیبات بیہودہ سے باز اور بلند رکھ سکتا ہے۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اصلاحی مقاصد کے پیش نظر متعدد ناول لکھے اور اپنے ناول کے کرداروں اور مکالموں کے ذریعہ اپنے نظریات پیش کیے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ فکری جمود، تنگ نظری کے خلاف بڑی جرأت اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۵۲

مذہبی تعصّبات ، کہنہ رسومات ، جاہلانہ اعتقاد کی مذمت کی۔ نذیر احمد ان تمام خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ وہ فرد اور سماج کو ان تمام خصوصیات سے آراستہ کرنا چاہتے تھے جن کے بغیر کوئی قوم دنیا میں پنپ سکتی ہے اور نہ کسی قسم کا معاشرتی نظام قائم رہ سکتا ہے۔ نذیر احمد کے موضوعات میں اتنی وسعت تھی کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''کوئی چیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں ہو سکتی۔'' [1]

ڈاکٹر روبینہ عقیل نے نذیر احمد کے ناولوں کو سوشل ناول کہا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں پروفیسر افتخار احمد صدیقی کے خیالات نقل کیے ہیں۔ اس لحاظ سے انھوں نے نذیر احمد کو جین آسٹین کے قریب بتایا ہے لیکن اپنے اصلاحی مقصد کے تحت گھریلو زندگی کی عکاسی کرنے کی وجہ سے ان کے ناولوں میں زندگی کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور جمود کی معاشرتی زندگی کے اہم مسائل اور متعدد پہلوان کے ناولوں میں سما گئے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں اجتماعیت کو زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے اور انسانوں کے باہمی میل جول کو انسانی ارتقاء کے لئے ضروری بتایا ہے۔ اس سلسلے میں موصوفہ نے نذیر احمد کے ناول ''فسانۂ مبتلا'' صفحہ ۲۵۵ سے ثبوت فراہم کیا ہے اور لکھا ہے:

> ''سماج کی اس سے بہتر تنظیم کا نقشہ اور کہاں دیکھنے کو ملے گا۔ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ معیار کی تعریف اس ابتدائی دور میں پیش کرنے کی صلاحیت صرف نذیر احمد کا خاصہ تھا۔'' [2]

ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی مشن کے بارے میں ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] مقالات سرسید سے مضامین رشید تک مؤلف فخر الاسلام اعظمی ص ۴۶

[2] مقالات سرسید سے مضامین رشید تک مؤلف فخر الاسلام اعظمی ص ۴۷

''غدر کے بعد معاشرت اور ادب میں اصلاح پسندوں کا دور دورہ ہوا ان میں نذیر احمد بھی تھے۔ انھوں نے سحر اور جادو سے بھرے ہوئے ایسے قصوں کو جن میں محبت کا ایک عجیب سا تصور تھا مخرب اخلاق سمجھ کر ایسے اصلاحی افسانے لکھنے کی کوشش کی جو زندگی سے قریب بھی ہو اور زندگی کو سنوارنے میں مدد بھی دیں۔ مراۃ العروس ایسی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لکھی گئی جو گھر کی چہار دیواری میں محدود رہتی ہیں اور جن کو دنیا کو سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس ناول میں نذیر احمد نے اپنے زمانے کی اخلاقی قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اصغری اور اکبری دو بہنوں کو دکھایا ہے۔ ایک بہن غضب کی ہوشیاری، ذہانت اور سلیقے سے کس طرح گھر کی حالت سنوار لیتی ہے اور اکبری اپنی آرام طلبی اور بد سلیقگی کی وجہ سے لاکھ کا گھر خاک کر دیتی ہے اور اپنی زندگی کی مسرتوں کو آہوں اور کراہوں سے بدل دیتی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے تدبیر اور تقدیر کا ذکر کر کے بھی لوگوں کی اس ذہنیت کی مخالفت کی ہے جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہونا ہے وہ پہلے سے ہی لکھ دیا ہے۔ اپنی کوشش اور سعی سے قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ انھوں نے بحث و مباحثہ کے علاوہ اصغری اور اکبری کے کرداروں سے بھی یہ واضح کیا ہے کہ تدبیر اور حکمت عملی سے اصغری اپنے گھر کو سنوار لیتی ہے اپنی خانگی زندگی کو مسرتوں سے معمور کر لیتی ہے۔ دوسری طرف اکبری اپنی تقدیر اور قسمت پر بھروسہ کیے بیٹھی رہتی ہے اور حالات بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے ایک سبق اور نکلتا ہے کہ جن لوگوں میں کام کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہوتا وہ کاہلی کی وجہ سے اپنے سر سے بوجھ ہٹا کر تقدیر کا سہارا لے لیتے ہیں اور اسی طرح خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔'' [1]

---

[1] معیار و میزان، ڈاکٹر مسیح الزماں ص ۱۳۲-۱۳۳

ڈپٹی نذیر احمد نے سات ناول لکھے ہیں ان سب ناولوں کے موضوعات کا تعلق سماج کے کسی نہ کسی مسئلہ سے ہے اور معاشرتی مسائل نذیر احمد کی زندگی کے اصلاحی اعمال وافکار سے متعلق ہیں۔ ہر ناول کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد رکھتا ہے۔ ''مراۃ العروس'' نذیر احمد کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا جس میں خاص طور پر امیر عورتوں کی اخلاقی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالیؔ:

> ''مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا اور وہ اس کو مسلمان شرفاء زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔'' [1]

شاید اس لئے کہ سرسید نے ناول کی کہانی کو تمام مسلم خواتین کی کہانی سمجھا حالاں کہ واقعہ ایسا نہیں تھا۔ نذیر احمد کے پیش نظر وہ مسلم خواتین تھیں جو متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں اور جو بلاشبہ تعلیم و تہذیب سے یکسر بے نیاز تھیں۔ سرسید کا خاندان اور افراد طبقہ اعلیٰ یا اشرفیہ میں شمار کیے جاتے تھے جو یقیناً اخلاق و عادات، سنجیدگی اور متانت میں بہت بلند تھے۔ سرسیدؒ کے مقابلے میں نذیر احمد کو متوسط طبقہ کے احوال بالخصوص مسلم مستورات کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا زیادہ اندازہ تھا اور انھوں نے ''مراۃ العروس'' میں اس طبقے کی سماجی اور اخلاقی حالت کا نقشہ دکھایا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ توہم پرستی، جہالت اور کج روی کی بنا پر ہمیشہ رنج و آلام کا شکار رہنے والی عورتوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح وہ تعلیم اور خاص طور پر جدید تعلیم حاصل کر کے نئی فکر اور عمل کے ذریعہ کس طرح وہ اپنی زندگی کو ایک

---

[1] حیات جاوید: حالی حصہ دوم ص ۶۹۳ طبع جدید لاہور، فروری ۱۹۵۷ء

خوشحال اور خوشگوار زندگی بنا سکتی ہیں۔ امور خانہ داری کا معاملہ یا پھر بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہو کس طرح وہ اپنی فکر، سوجھ بوجھ کے ذریعہ اس مسائل کو حل کر سکتی ہے ہیں۔

ایسی طرح انھوں نے اپنے دوسرے ناول ''بنات النعش'' میں معاشرتی زندگی سے متعلق معلومات عامہ کے مختلف پہلوؤں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے اور اس میں زندگی سے متعلق سائنسی مضامین کو بڑے ہی دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً علم جرثقیل، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، زمین گول ہے، زندگی کی حقیقت، زمین کا حجم، مختلف آب و ہوا، جغرافیہ، ہوا کی رفتار، سمندر، بادل، برسات، بجلی، روشنی، علم تاریخ ماہیت کے حوال وغیرہ۔ ان سے متعلق معلومات کو قصہ کے روپ میں پیش کر کے بچوں اور بچیوں کو نئی تہذیب اور نئی روشنی کی حقیقی بنیادوں سے روشناس کرایا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اولاد کی پرورش، تہذیب و تربیت، اخلاقی درستی، خیالات و اعتقادات کی اصلاح کے سلسلے میں والدین اور سرپستوں کو ذمہ دار بتایا ہے گویا اولاد کی نشوونما اور اصلاح بہت کچھ والدین کے کردار پر منحصر ہوتی ہے اور تاوقتے کہ والدین جب تک خود کو تہذیب و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کرنے کے اہل نہیں ہو جاتے اس وقت تک اولاد کی صحت مند تربیت ممکن نہیں ہے۔

بقول ڈپٹی نذیر احمد بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت کے سلسلے میں والدین استاد پر کم بھروسہ کریں اور پہلے اپنی نیک اطواری سے ان کے اعمال و کردار کو روشنی بخشیں۔ نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' مذہب اور اصول تعلیم کے سلسلے میں سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی کامیاب کوشش کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد جدید تعلیم کے ضرور خواہاں تھے مگر ان کے نظریہ کے مطابق مشرقی تہذیب کے کچھ مخصوص پہلوجوں کا توں باقی بھی رہنے چاہیے۔نذیر احمد اس زمانے میں بھی لڑکیوں کے تعلیم کے زبردست حامی تھے۔جس زمانے میں عورتوں اور لڑکیوں کو صرف گھر کی چہار دیواری میں مقید رکھا جاتا تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیتے تھے جدید تعلیم اور انگریزی وضع قطع اور طرز معاشرت کے باعث اپنی قوم سے بیگانہ نہیں ہونا چاہیے۔چنانچہ نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کے دو مقاصد بظاہر نظر آتے ہیں۔اول یہ کہ غدر کے ہنگامے کے سبب مسلمانوں پر تباہی آ گئی اور انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو بغض اور نفرت پیدا ہوئی اسے کس طرح فرو کرنا اور قومی آزادی کی سیاسی تحریک جو غدر کے کچھ عرصہ بعد ہی شروع کی گئی تھی مسلمانوں کو اس سے دور رکھنا۔دوسرا مقصد یہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید کے نقائص سے باز رکھا جائے۔ [1]

سرسید احمد کے خیالات و نظریات کو ایک معتدل اور متوازن انداز میں پیش کرنے کا کام نذیر احمد نے ہی کیا۔سرسیدؒ اور ان کے پیروؤں کو نیچری کہا گیا ہے۔نذیر احمد نے اپنے کو کبھی کبھی نیچری کہا ہے مگر اکثر اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ سرسید کا انجام دیکھ چکے تھے۔

نذیر احمد اور ان کے بڑے بھائی علی احمد کی تعلیم و تربیت دہلی کالج تک قریب ساتھ ہوئی ہے دونوں کو ایک کٹر مذہبی خاندان کے پروردہ تھے دونوں کو ڈپٹی نصر اللہ خان صاحب سے بجنور میں تعلیم کے سلسلے میں یکساں فائدہ اٹھانے کا موقع ملا لیکن نذیر احمد میں شروع ہی سے ترقی

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۶۱-۶۲

یافتہ عناصر کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی اور زندگی کی اچھی خراب قدروں کی پرکھ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ تھی اور عمدہ قدروں کو قبول کر کے اپنی زندگی کو بدلنے کا جذبہ بھی۔ سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی مرضی کی دہلی میں شادی کرڈالی۔ دلی کی ادبی اور علمی فضا سے وہ دلی میں آنے کے بعد ہی متاثر ہو گئے تھے۔ انھوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ جب مسجد کی زندگی پسند نہ آئی تو ازخود دہلی کالج میں داخلے کا انتظام کرلیا اور اپنی ذہانت اور تیز طبعی سے کالج میں اپنے بڑے بھائی کے داخلے کی بھی صورت پیدا کر لی اور شروع ہی سے اپنے اور اپنے بھائی کے لئے دو دو روپئے ماہانہ گذارے کے لئے وظیفہ کا بھی بندوبست کرلیا اس طرح اتنی کم عمری میں نذیر احمد نے اپنی اور اپنے بھائی کی گداگری کی زندگی کا خاتمہ دو تین سال کی اندر ہی کر دیا۔

دہلی کالج اس وقت جدید علوم کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا مغربی تہذیب دہلی کالج کے ذریعہ شمالی ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ ماسٹر رام چند، ضیاء الدین، صہبائی جیسے اساتذہ کے علاوہ بیرونی ممالک کے استاد بھی تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ، اور شہر کے جانے مانے عربی دان استاد مولوی مملوک صاحب بھی اس کالج سے وابستہ تھے گویا مغرب اور مشرق کی تہذیب کا سنگم دہلی کالج تھا ایک طرف ماسٹر رام چندر نے علی الاعلان اپنا مذہب ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا آزردہ وغیرہ معتدل خیالات کے مالک تھے۔

مسٹر رام چندر بہت ہی ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے طلباء ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ماسٹر رام چندر اپنے شاگردوں کے سامنے کبھی کبھی اپنے نئے مذہب کی مدح بھی کرتے تھے لیکن اس میں محبت اور خلوص ہوتا تھا جس کی وجہ سے طلباء ان سے متاثر ہوتے تھے ان کے شاگرد ذکاء اللہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑا مگر ان کے دوسرے شاگرد ڈپٹی نذیر احمد ڈگمگا گئے۔

صدیق الرحمان قدوائی نے اپنی تصنیف ''رام چندر'' میں اس بات کو اس طرح لکھا ہے:

> ''مگر نذیر احمد کے قدم ضرور ڈگمگا گئے اور ایک عرصے تک وہ اسلام اور عیسائیت اور الحاد کے درمیان کشاکش میں مبتلا رہے۔'' [1]

اس سے ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ذہن میں مذہبی کشمکش اور ایک طرح کا لگاؤ دہلی کالج کی دین ہے علوم جدیدہ سے دلچسپی بھی انھیں اسی کالج سے ملی تھی۔ کالج میں نئے نئے تعلیمی نصاب رائج تھے البتہ ان کو اس کالج میں انگریزی زبان سیکھنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن انگریزی زبان سے لگاؤ ان کو دہلی کالج سے ہی ہو گیا تھا۔ آخر کار ملازمت کے دوران انگریزی زبان از خود سیکھ لیا۔ انگریزوں کی صحبت میں رہ کر متعدد ترجمے بھی کئے جس سے ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی اور مالی فائدے بھی ہوئے نوکری میں ترقی ہوئی اور مالی اعتبار سے فارغ البالی نصیب ہوئی۔ سرسید احمد خاں دہلی کالج کے کبھی طالب علم نہیں تھے مغرب پرستی اور انگریزیت کے اثرات ان کے اندر ان کے انگریز دوستوں کی وجہ سے آئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ڈپٹی نذیر احمد باقاعدہ دہلی کالج کے طالب علم رہے ہیں مغربی تہذیب سے تعلق اور اس کے اثرات ان کو دہلی کالج سے ملے تھے۔ اس طرح سرسید احمد خاں نے بالواسطہ مغربی تہذیب سے فیض حاصل کیا جب کہ نذیر احمد نے براہ راست مغربی تہذیب دہلی کالج سے حاصل کیا تھا اسی لئے سرسید کے اندر ٹالریشن کی کمی تھی اگر چہ جرأت رندانہ کی زیادتی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تحریر کے انداز کو خود حاصل کیا تھا اور پھر ترجموں کی وجہ سے ان کے اندر اور پختگی آتی گئی اور یہ تحریر کا پختہ فن ان کے ناولوں میں جھلکتا ہے جب کہ سرسید احمد خاں کا نام ناول نگاری کے ضمن میں نہیں لیا جاتا۔ لہٰذا ڈپٹی نذیر احمد کا یہ فن بلا شرکت غیرے اپنی ایجاد ہے۔

---

[1] ماسٹر رام چندر - صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ۴۹

ڈپٹی نذیر احمد تعلیم نسواں کے پرزور حامی تھے اوران کو یہ موضوع اپنے استاد ماسٹر رام چندر سے ملا۔ تعلیم نسواں کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد نے مذہب سے بھی جوڑا ہے اور انھوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کے خلاف بالکل نہیں ہے انھوں نے اپنے رسالوں میں عورتوں کی تعلیم سے متعلق بہت سارے مضامین بھی لکھے ہیں۔ نذیر احمد نے تربیت اولاد پر مبنی ناول توبۃ النصوح کا موضوع بھی اپنے استاد ہی کے ایک اقتباس سے لیا ہے اس پر بھی علی گڈھ تحریک کا کوئی اثر نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ علی گڈھ تحریک میں عملی طور پر شریک ہونے کے وقت نذیر احمد کا شعور کافی پختہ ہو چکا تھا۔ ویسے سرسید اور نذیر احمد کی ایک دوسرے سے جانکاری قریب قریب آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن کے وقت سے ہی تھی جیسا کہ نذیر احمد نے اپنی تقریر ۹۸-۱۸۹۷ء میں سید صاحب کے انتقال پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے قریب قریب یہی سال وسن نکلتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے تعلیقات میں گہرائی مرأۃ العروس کی اشاعت کے بعد ہی آتی ہے اور ایک دوسرے سے خاص وابستگی کالج کے قیام کے سلسلے میں ہوتی ہے۔

علی گڈھ تحریک کے مشن میں عورتوں کی تعلیم کے تعلق سے بہت دیر میں پہل ہوئی اس کا سہرا بھی ڈپٹی نذیر احمد کے ہی سر ہے۔ اس زمانے میں حکومت لڑکیوں کی تعلیم پر زور دے رہی تھی جگہ جگہ لڑکیوں کے اسکول کھولے جارہے تھے لیکن اونچے طبقے کی لڑکیوں کے لئے کوئی خاص الگ سے انتظام نہیں تھا جو کچھ اسکول تھا اس میں مرد ہی تعلیم دیتے تھے چنانچہ اس زمانے میں مس کارپینٹر نے ہندوستان کا دورہ کیا اور یہاں لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت کمی کا احساس کیا اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے عورتوں کی جیل کا بھی معائنہ کیا اور حکومت کو عورتوں کا جیل میں الگ

سے انتظام اور لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں علیحدہ اسکول کا مشورہ حکومت کو دیا جہاں لڑکیوں کو عورتیں ہی تعلیم دیں لیکن حکومت کی سردمہری کی وجہ سے بہت دنوں تک ادھر توجہ نہیں دی جاسکی جس کی خاص وجہ لیڈی ٹیچر کا نہ ملنا بھی تھا انھیں وجوہات کی بناء پر ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس کی تصنیف کی لیکن سرسید احمد خاں نے اس کتاب پر جو تبصرہ کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید اس شعبے سے کوئی خاص رغبت نہیں رکھتے تھے۔ دراصل سرسید احمد خاں کا تعلق دہلی خاندان سے تھا جبکہ ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کے ہر طبقے کی خبر رکھتے تھے۔

سرسیدؒ کا خیال تھا کہ ہمارے لڑکے جب تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو وہ اپنی عورتوں کو پڑھا لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۱۹ ویں صدی کے آخر میں سید عبداللہ اور ان کی اہلیہ نے عورتوں کی تعلیم کی ابتدا کی یہ علی گڈھ تحریک کا لڑکیوں کا سب سے پہلا اسکول تھا۔ نذیر احمد کی اس پہل کا احساس اراکین علی گڈھ کو بھی تھا چنانچہ غلام الثقلین نے ۱۸۹۰ء کے قریب اپنی ایک تقریر میں نذیر احمد کی کوشش کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ ''بنات النعش'' اور ''مرأۃ العروس'' کی اشاعت کی بعد لوگوں کے اندر اس قسم کے قصے نصب کرنے کی بیداری پیدا ہوئی۔ چنانچہ مولانا حالی نے ایک کتاب ''مجالس النساء'' کے نام سے لکھی حالانکہ مولانا حالی اس میدان کے مرد نہیں تھے۔ اس کے بعد اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اس قسم کے قصے لکھے چنانچہ زنانہ لٹریچر کا بہت سارا مواد اکھٹا ہو گیا۔ اس طرح نذیر احمد کا یہ کارنامہ ان کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ بھی ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے یہ کوشش علی گڈھ تحریک کے ایک سیاہ گوشے کو منور کرتی ہے۔

ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد نذیر احمد کی دلچسپیاں ''علی گڈھ تحریک'' سے بڑھ گئیں۔ انھیں دنوں دہلی کالج، انگریزوں کے قائم کردہ مشنری کے اداروں پر وہ تنقیدی نظر ڈال

چکے تھے۔قومی اصلاح کا جذبہ ان کے سینے میں اور تیز ہو چکا تھا مذہبی بحران سے وہ یکسر باہر آ چکے تھے۔علی گڈھ تحریک کا رشتہ اپنی تہذیب وتمدن سے کٹا جا رہا تھا۔بنگال جو کہ انقلابی ذہن کے حامل تھے وہ یکسر اس رنگ میں رنگ گئے یہاں تک کہ اپنا لباس سب انگریزوں جیسا کرلیا حالانکہ اس کی وجہ سے وہ اقتصادی طور پر کافی پریشان رہتے تھے اس لئے کہ انگریزی تمدن کافی مہنگا پڑتا تھا اور دوسری طرف اس کا ایک اثر یہ پڑا کہ انگریزوں کے اندر احساس برتری آرہا تھا حالانکہ بہت سے انگریز ہندوستانیوں کو اپنے لباس میں پسند کرتے تھے لیکن انگریزوں کا ایک طبقہ اس کو ناپسند کرتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ہندوستانیوں کی اپنی تہذیب مٹ جائے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو جائیں اور درحقیقت دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج سیاسی طور پر رول ادا کر رہے تھے لیکن اس دوران ترک موالات کی تحریک شروع ہوگئی بدیشی اشیاء کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ڈپٹی نذیر احمد قومی تہذیب وتمدن کا اعلیٰ شعور رکھتے تھے وہ آزادی کے جذبہ سے سرشار ہی نہیں تھے وہ اس کا حقیقی شعور بھی رکھتے تھے۔وہ وقتی طور پر انگریزوں کی ماتحتی کو ضرور قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کو اپنا بدن اور لباس بنانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔علی گڈھ تحریک سے وفاداری اور علوم جدید سے اس کی دلچسپی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس کو وہ اپنی ذہنی غلامی کے عوض لینے کو تیار نہیں ہوئے''ابن الوقت''اس قسم کی غلامانہ ذہنیت پر ایک ضرب کاری ہے۔

نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے علاوہ اپنے لکچروں سے''علی گڈھ تحریک'' کی بے پناہ خدمت کی ہے۔نذیر احمد کو ناول نگاری کے لئے قلم اپنے سے ملا تھا اور ذہن تقریر کے لئے لائق اپنے ناولوں سے ملا نذیر احمد ناولوں کے ساتھ جہاں خوب بے پناہ خیالات اور نظریات لیکر اس تحریک میں شامل ہوئے تھے وہیں بے پناہ شہرت کے مالک بھی تھے۔ناول نگاری نے جہاں

نذیر احمد کی خطیبانہ صلاحیتا جاگر کی وہیں ناولوں کے ذریعہ حاصل کی گئی شہرت نے اسٹیج پر بھی ان کے قدم جما دیئے۔ اس طرح بے پناہ شہرت کے مالک ہو گئے۔ اسٹیج پر پہلی تقریر نے ان کو بے پناہ مقبول مقرر کی حیثیت سے مشہور کر دیا۔ وہ ادبی اور علمی ہر طبقے کے ساتھ بیٹھتے تھے اس طرح ان کو کئی طرح کے لوگوں کا تعاون حاصل تھا جس کی وجہ سے ''علی گڑھ تحریک'' کو بے پناہ فائدہ پہنچا۔ اسی اعتماد کے بنا پر نذیر احمد نے تہذیب الاخلاق کو تیسری مرتبہ سرسید کے آخری ایام میں جاری کرا دیا۔ نذیر احمد جانتے تھے ایسے افکار و خیالات کے پھلنے اور پھولنے کا زمانہ آیا ہے جس کو یہ رسالہ پیش کرنا چاہتا ہے ان اشاعتوں میں نذیر احمد کے چند مضامین ملتے ہیں۔ تیسری مرتبہ یہ رسالہ بہت کم مدت تک جاری رہ سکا اس کی وجہ عوام کی مخالفت نہیں تھی بلکہ سرسید اور ان کے دوسرے رفقاء کی بے توجہی تھی۔ اس کے علاوہ نذیر احمد صحافت نگاری سے نابلد بھی تھے اور دہلی چھوڑ کر ان سے کہیں رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس اجراء کے پہلے شمارے میں واضح طور سے اعتراف بھی ملتا ہے کہ اس کا سہرا نذیر احمد کے سر بندھتا ہے۔

نواب محسن الملک نے اپنی ایک صدارتی تقریر میں نذیر احمد کی تحریروں کی اہمیت کا حسب ذیل طریقہ سے اعتراف کیا ہے:

> ''......آج لوگ دو دن کے تھکے ہوئے تھے، پانی بھی برستا تھا، رات کا وقت تھا، اندھیری خوب چھائی ہوئی تھی، میں دل میں سوچتا تھا کہ آج سب سے اول مجلس میں پہنچنے والوں میں غالباً میں ہی ہوں گا۔ مگر صاحبو! یقین جانیے کہ اس ہال کے دروازے پر پہنچتے ہی میں حیران رہ گیا کہ اگر میں پریسیڈنٹ نہ ہوتا تو غالباً مجھے ہال کے اندر آنے اور بیٹھنے کو بھی جگہ نہ ملتی، کرسیوں، بینچوں اور گیلری کا تو ذکر کیا ہے کسی مقام پر آدمی کے کھڑے

ہونے کی جگہ بلکہ یوں کہیے کہ تل دھرنے کو بھی نہ تھی۔ لکچر سننے کا شوق اسے کہتے ہیں اور لکچرار ایسے ہوتے ہیں اور خدا داد قابلیت اس طور سے لوگوں کے دل اپنی طرف بجر وکراہ کھینچ لیتی ہے، یہ وہ حالت ہے جو ہم یورپ کے مشہور اور نامور لکچراروں کی نسبت سنا کرتے تھے مگر الحمدللہ کہ آج ہم نے اپنی قوم میں یہ حالت دیکھ لی اور یہ حسرت کہ مسلمانوں میں کوئی ہیریسن، فریڈرک اور میکس ملر نہیں باقی نہیں رہی۔" [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں زیادہ تر طیبہ مدرسہ اور ایجوکیشنل کانفرنس میں کی ہیں مگر ہر جگہ ان کا مقصد اصلاح ہی ہوتا ہے اور دیگر انجمنوں نے بھی انھیں بار ہا مدعو کیا مگر وہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ ایک بار ندوۃ العلماء کا جلسہ دہلی میں ہو رہا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی بضد ہو گئے کہ آپ کو اس کانفرنس میں آنا ہے مگر انھوں نے معذرت کر لی اور جلسے میں شریک نہیں ہوئے، اسے اپنے اصولوں کے خلاف محسوس کرتے تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے وہ خوشی محسوس کرتے تھے اور اس کے لیے طویل تقریر نوٹ کرلاتے تھے اس لیے کہ وہ سرسید کے مقصد سے واقف تھے۔ وہ سرسیدؒ کو اپنا مربی تسلیم کرتے تھے اور ان کا حد سے زیادہ احترام بھی کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کا اصرار تھا کہ ہمیں سرسیدؒ کے مریدوں میں نہ شمار کیا جائے۔ خود ہی ایک جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مجھے کبھی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ ہوتا تو میں سرسیدؒ کے ہی ہاتھ پر بیعت کرتا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی طبیعت ایسی تھی کہ جس کے اندر جو خوبی دیکھتے تھے اس کا دل کھول کر اعتراف کرتے تھے شاعری کے سلسلے میں ہمیشہ مولانا الطاف حسین حالی کا نام لیتے ہیں اور حساب

---

[1] مجموعہ لکچر اسپیچز، محسن الملک ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۳ء ص ۲۳

(ریاضی) کے سلسلے میں منشی ذکاء اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی تقریر میں ادب، سائنس ہر موضوع پر جامع تبصرہ ملتا ہے جس سے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے اگرچہ ان کی تنقیدی تحریروں پر بھی اصلاح کا پردہ پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے گویا ہر انداز میں ان کا اصلاحی مشن چلتا ہی رہتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تقریروں سے علی گڈھ تحریک کو اقتصادی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ وہ اپنی تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو اپنے بس میں کر لیا کرتے تھے، عورتیں زیورات تک چندے میں دے ڈالتی تھیں۔

نذیر احمد علی گڈھ تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے اندر جمود اور تعطل پیدا ہوتا جا رہا ہے، مغرب پسندی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے، وہ علوم جدیدہ کے قائل تو تھے مگر قوم کی انفرادیت کے بھی حامی تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ علی گڈھ تحریک کالج تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ گئی ہے۔ شاید اسی لئے انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے تیسری بار اجراء پر زور دیا۔ اپنی تقریروں میں وہ مذہب کو زیادہ دخل دیا کرتے تھے جب کہ سرسید ایمان بالغیب کی تمام چیزوں کو کھینچ کھینچ کر عقل کی حدود میں لا رہے تھے جب کہ ڈپٹی نذیر مذہب میں عقل سے ماورا باتوں کو بھی مانتے تھے اور اس کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں عقل پسندی کی ایک حد مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اپنی تقریر میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ عقل بھی ایک مقام پر پہنچ کر جبرئیل کی ہم زبان بن جاتی ہے۔ اس ایک جملے میں وحی، الہام اور مذہب کا مافوق الفطرت ہونا تمام اشیا آ جاتی ہیں۔ ایک جگہ وہ اپنے لکچر میں نیچریوں اور اپنے درمیان حسب ذیل الفاظ میں حد فاصل قائم کرتے ہیں:

''طبیعت میری بھی نیچریوں کی سی واقع ہوئی ہے فرق اتنا ہے کہ نیچری

حتی الوسع وسائل کی طرف داری کرتے ہیں اور میں حتی الوسع اسلام کی۔'' [۱]

نذیر احمد نے علی گڈھ تحریک کے سیاسی جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر بیک نے اس تحریک کو حکومت کا ایک آرگن بنا دیا تھا۔ سرسید اپنی آخری عمر میں بنگالیوں کا کی تحریک آزادی اور حکومت میں حصہ مانگنے پر بنگالیوں کا پاگل پن خیال کرتے تھے۔ نذیر حمد بھی انگریزوں کی حکومت کو اپنے لوگوں کی حکومت سے اچھا خیال کرتے تھے اور مغرب کی برکتوں کا فراخدلی سے اعتراف کرتے تھے، مگر دوسری تحریروں کے مطالعہ سے ان کے کرب کا واضح طور پر احساس ہوجاتا ہے۔ مغرب کی ترقیوں سے وہ متاثر ضرور تھے لیکن انگریز پرست بھی نہیں تھے۔ علی گڈھ تحریک کے اس کمزور پہلو پر وہ بھرپور حملے کرتے ہیں اور اس میں پیدا ہوگئے ایک طرح کے سیاسی جمود کو توڑنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

نذیر احمد کے اصلاحی مشن کی کڑیوں میں دینی کتب اور عربی تراجم بھی بے حد اہم ہیں۔ قرآن شریف کا ادبی ترجمہ کیا۔ علی گڈھ کی تحریک کے کسی رکن نے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا البتہ سرسیدؒ نے کیا تھا مگر اس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے جب کہ نذیر احمد کا ترجمہ اس قدر مشہور ہوا کہ متعدد ایڈیشن ان کی حیات مبارکہ میں ہی شائع ہوئے۔ علی گڈھ تحریک کی اس کمی کو نذیر احمد نے ہی پورا کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت سے بے حد متاثر تھے اور یہی خوبی وہ اپنے ترجمے میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح انھوں نے اس ترجمہ کو تخلیق کے درجہ تک پہنچا دیا۔

اس ترجمہ کے علاوہ الحقوق والفرائض، الاجتہاد، ادعیۃ القرآن، دہ سورۃ، امہات الامتہ

---

[۱] لکچروں کا مجموعہ از نذیر احمد جلد اول ص ۵۷۳

اور مطالب قرآن وغیرہ ان کی اہم دینی کتب ہیں البتہ مطالب قرآن ان کی آخری اور نامکمل کتاب ہے۔

سماجی اور معاشرتی خرابیوں کے خلاف بغاوت کے نقوش نذیر احمد کی ابتدائی تحریروں سے ملتے ہیں۔ امہات الامتہ میں فرسودہ مذہبی تحقیق کے خلاف بغاوت تھی، مراۃ العروس میں سماجی اور معاشرتی بغاوت تھی۔

نذیر احمد نے اپنے جن خیالات کی تشہیر اور ترویج اپنے ناولوں میں پوشیدہ طور پر کیا ہے ان میں سے زیادہ تر خیالات کی اپنے لکچروں اور موعظ حسنہ کے خطوں میں کافی واضح طور پر تشریح کر دی ہے۔ ان اختلافات کو ناول کا موضوع، خلوص اور صاف گوئی کے فقدان کی وجہ سے نہیں بنایا گیا بلکہ عوام اور ادب کے لیے، جس کا اعتراف اسی اقتباس میں خود ڈاکٹر سید عبداللہ بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات کرنے کے نئے نئے انداز کو پیدا کرنے کے شوق میں بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔

مذہب میں تشدد کو وہ رہبانیت کے مصداق خیال کرتے تھے، اس بات کو وہ لکچروں اور مختلف موقعوں پر تحریروں کے ذریعہ بھی دنیا کے سامنے لاتے تھے۔ چنانچہ وہ شریعت اور مذہب کے دلدادہ ہونے کے باوجود ایک موقع پر اپنے بڑے بھائی علی احمد کے لیے جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو یونانی علاج کو چھوڑ کر ڈاکٹری علاج پر زور دیا۔ وہ قدامت پسند نہیں تھے بلکہ وہ زندگی بھر رجائی رہے ہیں۔ لہٰذا جن لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے ناول ''حجۃ الاسلام'' میں نذیر احمد نے خود کو پیش کیا ہے بالکل غلط ہے اس لیے کہ یہاں معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔

نذیر احمد نے علی گڈھ تحریک میں دہلی کالج کی روح کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ علی

گڈھ تحریک کو دہلی کالج کی تعلیم کی اعلیٰ روایات سے فیضاب کیا۔ ترجمے کی نئی روشنی عطا کیا، اصلاح سازی کا کام کیا، مذہب کو مستحکم اور ٹھوس خیالات اور نظریات دے کر سرسیدؒ اور ان کے شدت پسند رفقاء کو متوازن اور متعدل بنایا، تجارت کے مشن کو عملاً کر کے دکھایا، اُردو زبان کو ایک اچھوتا اسلوب بیان عطا کیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''سرسیدؒ کے ادب میں حقیقت زیادہ ہے اور افسانیت جو اعلیٰ ادب خصوصاً رومانی ادب میں موجود ہوتی ہے کم ہے۔ ان کے یہاں جذبات پر عقل کی کارفرمائی ہے جس کے بوجھ کی نیچے بیچارے جذبات کچل دیئے گئے ہیں۔'' [۱]

نذیر احمد نے اُردو زبان کو دلکش بنانے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے عوام کی بول چال سے بھی محاورات لے کر اس میں سمو دیا۔ قصہ نویسی کا ایک جدید طرز دیا جو جدید ناول کے درجہ پر پہنچ گیا۔ مذہبی خیالات کے اظہار کا ایک عام پسند اسلوب بیان کیا۔ جدید مذہبی تحقیق کی بنیاد ڈالی، انداز بیان میں شوخی و ظرافت کو شامل کر کے عبارت کو دلکش بنانے کا ایک نیا انداز سکھایا۔ ان کے اسلوب میں شبلی کے برعکس پھیلنے کا رُجحان ملتا ہے یہ ان کی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا۔ اُردو نثر نگاری میں انھوں نے ایک نئی اور مضبوط مکالمہ نگاری کی روایت کو قائم کیا اس میں علی گڈھ تحریک کا کوئی فرد اس میں ان کا حریف نظر نہیں آتا۔ عوام کے اندر تعلیم کے شوق کو جنم دیا اور اپنی تحریروں سے عوام کے ذوق وجدان اور شعور کی جدید انداز میں تربیت کی یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ علی گڈھ تحریک کا کوئی ممبر اس حیثیت سے ان کا حریف نظر نہیں آتا۔

نذیر احمد نے علی گڈھ تحریک کو اپنی تقریروں سے بے پناہ مالی فائدہ پہنچایا۔ اس طرح

---

[۱] علی گڈھ تحریک نمبر ۶، سرسید کا اثر ادبیات اُردو پر ص ۲۸۵

کالج کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔اس سلسلے میں نذیر احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے عوام کو روشناس نہیں کرایا بلکہ عام فہم بھی بنا دیا۔ [1]

اس طرح تحریک کی ابدیت اور آفاقیت میں نذیر احمد کا سب سے بڑا حصہ ہے۔اس طرح نذیر احمد کے یہاں اس تحریک کے ساتھ وابستہ رہ کر جرأت، اجتہاد، بغاوت ہر چیز ملتی ہے لیکن سب چیزوں میں ان کے یہاں ایک قسم کی اعلیٰ تنظیم اور سلیقہ مندی کارفرما نظر آتی ہے۔ بہت کم ایسے مواقع ملیں گے جہاں انھوں نے اپنے ان زرّیں اصولوں کو توڑا ہو۔ [۲]

□□□□

[۱] علی گڈھ تحریک نمبر ۶ سرسید کا اثر ادبیات اُردو پر ص ۲۸۵
[۲] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) اشفاق اعظمی ص ۷۹

باب سوم

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے مختلف ادوار

(الف) ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے دور کے ناولوں میں اصلاحی رُجحانات

(i) مراۃ العروس

(ii) بنات النعش

(iii) توبۃ النصوح

ڈپٹی نذیر احمد نے سات ناول لکھے ہیں ان سب ناولوں کے موضوعات کا تعلق کسی نہ کسی معاشرتی مسئلے سے ہے اور معاشرتی مسائل نذیر احمد کی اپنی زندگی اور ہم سب کی، زندگی کے تجربات، نظریات اور اصلاحی اعمال و افکار سے متعلق ہیں۔ ان ناولوں میں نذیر احمد کی شخصیت اور انفرادیت کی چھاپ واضح طور پر نمایاں ہے۔ ہر ناول کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد رکھتا ہے۔ علی گڈھ کی اصلاحی تحریک، سرسیدؒ سے رفاقت اور نظریاتی اختلاف مگر اصلاحی پروگرام میں اتحاد و اتفاق، یہ سب ملکر ناولوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ مراۃ العروس نذیر احمد کا پہلا ناول ہے، گویا اردو کا پہلا ناول ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی جب سرسید احمد خاں نے پڑھا تو انھیں رنج ہوا بقول مولانا الطاف حسین حالؔی:

> ''مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا اور وہ اس کو مسلمان شرفاء کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔'' [1]

شاید اس لئے کہ سرسید کی کہانی کو تمام مسلم خواتین کی کہانی سمجھا، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں تھا نذیر احمد کے پیش نظر وہ مسلم خاندان کی خواتین تھیں جو متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں اور بلا شبہہ تعلیم وتہذیب سے یکسر بے نیاز تھیں۔

---

[1] مولانا الطاف حالی ص

چونکہ نذیر احمد کو متوسط طبقے کے احوال بالخصوص مستورات کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا زیادہ اندازہ تھا اور انھوں نے مراۃ العروس میں اس طبقے کی سماجیہ اور اخلاقی حالت کا نقشہ دیکھایا ہے مراۃ العروس اور اس کے بعد کے دو ناولوں کی تصنیف کا محرک اولاً اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت تھی اس لئے کہ اس وقت مدرسوں میں جو کتابیں پڑھا کی جاتی تھیں اس میں اخلاقیات سے متعلق باتیں بالکل ہی نہیں تھیں غیر ضرور باتوں کے علاوہ قصے، کہانیاں، ہی کہانیاں ہوا کرتی تھیں ایسی کتابیں نایاب تھیں جس سے تہذیب واخلاق کی اصلاح ہوسکتی۔ خاص طور پر عورتوں کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح سے متعلق کتابوں کا سرے سے فقدان تھا نذیر احمد نے بہت ہی شدت سے اس کمی کا احساس کیا کہ قوم کے بچوں کی تعلیم تربیت کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔

چنانچہ نذیر احمد نے اپنی کتاب ''مراۃ العروس'' میں دہلی کی ایک متوسط شریف خاندان کی زندگی کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح عورتیں اپنی حیات، کجی روی اور تو ہم پرستی کی وجہ سے ہمیشہ رنج وآلام میں گرفتار رہتی ہیں اس ناول کے اندر دو بہنیں اصغری و اکبری ممتاز کردار ہیں دونوں بہنوں کی عادت وفطرت ایک دوسرے کے ضد ہے چھوٹی بہن اصغری صالح اخلاق کی نمائندہ ہے اس کردار بہت ہی اہم اور واضح ہے۔

اکبری (بڑی بہن) اپنی ماں اور نانی کی لاڈلی تھی ان بزرگوں کے لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بہت حد تک ضدی طبیعت کی ہوگئی گھر کے اندر کسی کام سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ سینا پرونا، کھانا بنانا اور دیگر امور خانہ داری سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ دن بھر پاس پڑوس کی کم مرتبہ لڑکیوں، سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ

پھوہڑلڑکی ہوکررہ گئی اورگھر کا کوئی بڑا بزرگ اس کوڈانٹتا یا سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ بگڑ جاتی اورلڑکوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے لگتی ضد میں آکر سامانوں کوتوڑنے پھوڑنے لگتی نماز روزے کی بھی وہ کبھی پابندنہیں رہی ان بری عادتوں کی وجہ سے شادی کے بعد اس کا نبھاہ اپنی ساس کے ساتھ نہ ہوسکا آئے دن سسرال والوں سے جھگڑا رہتا تھا اس کا شوہر محمد عاقل بھی اس سے حیران اور عاجز تھا بالآخر ایک دن لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی آئی۔ اس کا مطالبہ تھا کے وہ سسرال والوں سے الگ مکان لیکر اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی چنانچہ اس کا یہ مطالبہ بھی پورا کردیا گیا۔ مگر علاحدہ رہ کر بھی وہ اپنا انتظام نہ سنبھال سکی اور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہی محمد عاقل کی عقل مندی کی وجہ سے جیسے تیسے نبھاہ ہوتا رہا اگر وہ بھی نامعقول ہوتا تو تعلقات ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتے۔

اکبری کے برعکس اصغری کا زیادہ لاڈ پیار نہیں ہوا تھا اس کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ بچپن سے صبح سویرے اٹھنا صفائی کرنا نماز پڑھنا سینا پرونا اور کھانا پکانے کا انتظام کرنا گویا اس کے یومیہ معمولات میں شامل تھے ان فرائض کی ادائیگی کے علاوہ اصغری میں بزرگوں کا ادب، چھوٹوں کی عزت خدمت گذاری اور مہمان نوازی کی خصوصیات بھی تھیں وہ بہت ہی عقلمند اور صالح واقع ہوئی تھی۔ چونکہ اصغری نے بچپن سے ہی اچھی تربیت پائی تھی اس لئے شادی کے بعد اسے اپنی سسرال میں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی اس نے شادی کے کچھ دن بعد ہی سسرال کے گھر بگڑے ماحول اور نظام کو نہایت صبر وتحمل سے حل کیا سب لوگوں پر اس بات کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ اصغری کے سگھڑ پن کی وجہ سے سسرال کے گھر میں خوشحال پیدا ہوگئی وہ بہت جلد سب کی نظروں میں محترم بن گئی۔ ان خصائل اور صفات کی وجہ سے لوگ انھیں تمیز دار بہو

کہنے لگے جب کہ اکبری کے سسرال والوں نے اس اس کی حماقتوں کی وجہ سے اس کو مزاج دار کا لقب دیا تھا۔ غرض اصغری اپنی نیک عادات والوں کی وجہ سے ہمیشہ خوش خرم رہی اور اکبری اپنی بدمزاجی کی وجہ سے ہمیشہ روتی رہی حالانکہ دونوں نے ایک ہی گھر میں پرورش پائی تھی مگر ان کے مختلف اعمال و کردار اور اس کے نتائج کی الگ الگ تربیت کا نتیجہ ہیں۔

ناول مراۃ العروس نذیر احمد کی پہلی تصنیف ہے جس نے انھیں صف اول کی فن کاروں میں لاکر کھڑا کر دیا۔ نذیر احمد کا یہ ناول اس قدر مقبول عام و خاص ہوا کہ ان کی زندگی میں ہی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ۱۸۶۹ء میں حکومت انھیں ایک ہزار روپئے کا انعام عطا کیا اور ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس کو داخل نصاب کیا گیا مختلف زمانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اس کی اشاعت کے ۹ سال بعد انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس ناول کا ترجمہ یورپ کی دوسری زبانوں خاص کر فرانسیسی میں ہوا تھا لفٹنٹ گونر میور صاحب نے ایک سو چھ روپئے کی قلائی گھڑی انھیں بطور انعام عطا کیا تھا جس پر ان کا نام کندہ تھا۔ مسٹر کیمپسن صاحب نذیر احمد کو ۲۰ دسمبر ۱۸۷۸ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں مراۃ العروس کا ترجمہ کر رہا ہوں اور میری میز پر مراۃ العروس، توبۃ النصوح اور بنات النعش رکھی ہے۔'' [۱]

کیمپسن صاحب کے اس خط سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نذیر احمد کو ان کے انگریز حکام کس قدر مانتے تھے ان کی ادبی صلاحیتوں کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے تھے یہ تمام باتیں اس ناول کی اہمیت کو ظاہر کر رہی ہین۔ مراۃ العروس میں ان کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ ایسی باتیں ضرور ہونگی جو اس وقت ناول کے لئے محاسن خیال کئے جاتے تھے۔

---

[۱] حیات النذیر ص ۱۶۰

مراۃ العروس میں سب سے پہلے ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں نذیر احمد نے واضح طور سے اپنی تصنیف پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کو نئے طرز کی کتاب بتائی ہے نذیر احمد کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

> ''جو وقت اس کتاب کی تصنیف پر صرف ہوا اس کے علاوہ مدتوں یہ کتاب اس غرض سے ہے پیش نظر رہی کہ بولی یا محارہ ہو، خیالات پاکیزہ، اور کسی بات میں آورد اور بناوٹ کا دخل نہ ہو، چونکہ بالکل نئے انداز کی کتاب ہے عجب کہ پھر بھی اس میں کسرہ گئی ہو۔'' [1]

عقب مذکورہ اقتباس سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ نذیر احمد کا مراۃ العروس کی تصنیف سے ایک مقصد اردو میں ایک طرز جدید کا اضافہ بھی کرنا تھا اس میں شعوری طور پر قصہ نویسی کے ایک نئے طرز کو جنم دینے کی کوشش کی ہے ان کا یہ خیال ان کے بدلے ہوئے ذہن کا پتہ دیتا ہے۔

مراۃ العروس میں ایک طویل مقدمہ ہے جو دیباچہ کے بعد ہے اس مقدمہ میں عورتوں کے لکھنے پڑھنے کی ضرورت اور اس کی حالت کے مناسب حال کچھ نصیحتیں ہیں۔ اور اس مقدمے میں عورتوں اور خاص کر مسلمان عورتوں کے لئے تعلیم کی ضرورتوں کو دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نذیر احمد نے عورتوں کے متعلق ایک جگہ اپنی عام رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''ہماری عورتیں حیاء پاک دامنی، پردہ داری نیکی جو کچھ سمجھو خدا کے فضل و کرم سے بہتری ہے۔ مگر برا مانو تو یا بھلا مانو ابھی تک ہے مجبوری کی یعنی مذہب اور ملکی رواج اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کی زبردستی نیک بنا رکھا ہے۔ لیکن اگر خود عورتوں کے دل سے نیکی کا تقاضہ ہو تو سبحان اللہ! نورٌ

---

[1] مراۃ العروس دیباچہ ص ۴

علیٰ نور ہے۔ مگر دل سے نیکی کے تقاضے کے پیدا ہونے کی علم کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے۔'' [1]

اپنے ناول مراۃ العروس کے اندر ڈپٹی نذیر احمد نے مرد اور عورت کی جسمانی و ذہنی صلاحیت کو اجاگر کیا ہے اور ان کے روز مرہ کی ضرورتوں اور ان کے حاصل کرنے کے تناظر میں بہت ہی دلچسپ بحث کی ہے ان کا کہنا ہے کہ اگر چہ مرد روزی کمانے کے لئے سر پر بوجھ اٹھاتا ہے لکڑیاں چیرتا ہے آئینہ سازی کرتا ہے اور پارچہ بافی کرتا ہے مگر کسی کا کام جسمانی اور دماغی تکلیف سے خالی نہیں اور روپے کی خاطر یہ تمام تکلیف مردوں کو ہی سہنی اور اٹھانی پڑتی ہے اور عورتوں کو کھانے اور سورہنے کے سوا کوئی کام نہیں بلکہ مرد جو کمائی عورتوں کے آگے لا کر رکھ دیتے ہیں عورتیں اپنی عقل سے اس کو بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی ہیں پس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی۔ مردوں کو روپے کمانے سے اتنا وقت نہیں بچتا کہ گھر کے کاموں میں صرف کریں اے لڑکو! وہ بات سیکھو کہ مرد ہو کر تمہارے کام آئے اور اے لڑکیوں! ایسا ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو بے شک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے۔ لیکن ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، آنکھ یادداشت سب چیزیں مردوں کے برابر دی گئی ہیں لڑکے انہی چیزوں سے کام لیکر فن میں طاق اور ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنا وقت گڑیا کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں وہ ایسی ہی بے ہنر رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانا اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا، ہنر سیکھا، لیاقت حاصل کی وہ مردوں سے کسی بات میں کم نہیں رہیں نذیر احمد کا کہنا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کو دیکھو عورت ذات ہو کر کس کس شان اور کس ناموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے

---

[1] مراۃ العروس ص ۱۶

بڑے ملک کا انتظام کر رہی ہیں کہ دنیا میں کسی بادشاہ کو یہ بات نصیب نہیں۔ جب ایک عورت نے سلطنت جیسے کٹھن کام کو اور سلطنت بھی ماشاء اللہ اس قدر وسیع کہ ایسے نازک وقت میں بات منھ سے نکلی اور اخبار والوں نے بتنگڑ بنا دیا' اتنی مدت دراز تک سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ جو سنبھالنے کا حق ہے تو اب عورتوں کی خداداد قابلیت میں کلام کرنا سرے سے ہٹ دھرمی ہے۔[1]

ڈپٹی نذیر احمد کے مطابق ضروری نہیں ہے کہ پڑھنے کے بعد نوکری حاصل ہو ہی جائے نوکری ایک الگ چیز ہے اور علم کی فوقیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جو لوگ تعلیم کو صرف نوکری کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں حقیقت میں ان کی نظروں میں علم کی کوئی بھی قدر نہیں۔ اگر کسی کو نوکری نہیں ملی تو اس کا علم اکارت نہیں چلا گیا۔ کہاں سے قوت بیان لائیں اور تم کو علم کے فائدے سمجھائیں۔ ظاہر کی دو آنکھیں ہمارے تمہارے سب کے منھ پر ہیں۔ کبھی اندھے فقیروں کی دعا سنو کس حسرت سے کہتے ہیں بابا آنکھیا بڑی نعمت ہیں' شاید کوئی بھی ایسا سنگ دل نہ ہوگا جن کو اندھوں کی معذوری اور بے کسی پر رحم نہ آیا ہو لیکن دل کے اندھے جن کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا، ان سے کہیں زیادہ قابل رحم ہیں۔[2]

ڈپٹی نذیر احمد کے دور میں عورتوں میں خاص طور پر تعلیم کا فقدان تھا دلی جیسے بڑے شہر میں مشکل سے سو سوا سو عورتیں پڑھی لکھی تھیں وہ بھی شاید حرف شناس نکلیں ان سب کمیوں کے باوجود عورتوں کے لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں عورتیں اگر پڑھی لکھی ہوگئیں ان کی آنکھیں چار ہو جائیں اور غیر مردوں سے خط و کتابت کرنے لگیں اور نتیجے کے طور پر پاک دامنی اور پردہ داری میں کسی طرح کا فتور واقع

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ڈپٹی نذیر احمد ص۷۹۶

[2] مراۃ العروس ڈپٹی نذیر احمد ص۷۹۶

ہو جائے جبکہ یہ صرف شیطانی وسوسے ہیں اور ملک کی خصوصا عورتوں کی بدنصیبی ہے جبکہ علم انسان کی اصلاح کرتا ہے علم سے اگر کوئی فتور واقع ہوتا ہے مردوں میں یہ برے لچھن پائے جاتے۔ بے شک بعض پڑھے لکھے مرد بھی آوارہ بدوضع ہوتے ہیں لیکن کیا علم نے ان کو آوارگی اور بد وضعی سکھائی ؟ نہیں نہیں، آوارگی اور بدوضعی انھوں نے بری صحبت میں سیکھی یا کھجلی اور کوڑھ کی طرح ان کو اڑ کر لگی اور پڑھ کر ان کی برائی مثلا چھٹانک بھر ہے تو نہ پڑھنے کی صورت میں ضرور سیر سوا سیر ہوتی۔ مثلا سو پڑھے لکھوں پر نظر ڈالو تو اکا دکا شامت زدہ خراب ہو تو ہو ورنہ خدا نے چاہا تو نیک بھلے مانس، ماں باپ کا ادب کرنے والے، روزہ رکھنے والے سچ بولنے والے غریبوں پر ترس کھانے والے، غصے کو پی جانے والے، بزرگوں کی نصیحت پر چلنے والے،، شکر گذاری کے ساتھ زندگی گذارنے والے ملیں گے۔ جو شخص علم بدنام کرتا ہے آسما پر تھوکتا اور چاند پر خاک ڈالتا ہے بے شک بعض برے لوگوں نے بری کتابیں دنیا میں پھیلا دی ہیں لیکن اس خیال سے کہ آنکھ بری جگہ پڑسکتی ہے۔ یا زبان سے بعض نالائق کوستے، جھوٹ بولتے گالیاں بکتے بلاضرورت قسم کھاتے یا لوگوں کی غیبت کرتے ہیں تو آنکھیں پھوڑی جاتی ہیں یہ زبان کاٹی جاتی ہے تو صرف علم نے کیا قصور کیا ہے کہ ایک لغو اور بے اصل احتمال کی بنیاد پر عورتوں کو اس کے بے انتہا دینی اور دنیاوی فائدوں سے محروم رکھا جائے کیا اتنا نہیں ہوسکتا کہ بیہودہ کتابوں کو مستورات کی نظر سے نہ گذرنے دیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مطابق آدمی کو خدا نے آزاد بنایا ہے اب ایسے میں اگر اس کو کسی کام کے لئے مجبور کیا جائے تو چارہ اس کام کو کر دیگا مگر اس کام میں عمدگی اور قوت اعتمادی نہیں آئیگی بہ نسبت اس کام کے جس کو وہ اپنے تقاضے اور شوق سے کرتا ہے۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد تمثیل کے پیرائے میں ایک بات بتانا چاہتے ہیں کہ جو لڑکا پڑھنے نہ جائے اس کا دل کتابوں میں نہ

لگے اس کو زبردستی اگر بھیج بھی دیا جائے تو وہ وقت گذار کر بغیر کچھ سیکھے ہوئے واپس آجائیگا اس کے مقابلے میں وہ لڑکا جو اپنے شوق سے مدرسہ جاتا ہے مطالعہ کرتا ہے وہ امتحان مین پاس ہوجاتا ہے اور نسبتا دوسرا لڑکا فیل ہوجاتا ہے۔ اس بات کو اسی موضوع کو ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کی تعلیم اور عورتوں کے طریقہ کار عورتوں کی سلیقگی کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں کہ دوسروں کو کہنے سے جو کام کیا جاتا ہے اس میں اور جو اپنی طبیعت اور ذوق اور علم سے کیا جاتا ہے دونوں میں فرق ہوتا ہے چنانچہ نذیر احمد کہتے ہیں کہ:

> ''عورتوں میں حیا، پاکدامنی، پردہ داری، نیکی جو کچھ سمجھو خدا کے فضل وکرم سے بہتر ہی ہے۔ مگر برا مانو بھلا مانو! ابھی تک ہے مجبوری کی یعنی مذہب اور ملکی رواج اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کو زبرستی نیک بنا رکھا ہے لیکن اگر خود عورتوں کے دل سے نیکی کا تقاضا ہو تو سبحان اللہ نور علیٰ نور۔ ایک سونا کھرا، اوپر سے ملا سہاگہ کیا کہنا مگر دل سے نیکی پیدا ہونے کی علم کے سوا اور کوئی تدبیر ہی نہیں۔ بس جو لوگ عورتوں کو علم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں گویا ان کو سچی اور حقیقی، پاکیزہ، بے لوث، کھری اور پائیدار نیک دلی سے روکتے ہیں۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد کے مطابق ماں کے تعلیم یافتہ ہونے سے بچوں کی پرورش میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ مائیں باتوں باتوں میں بچوں کو سکھاتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ بچوں کی طبیعت پر گرانی نہیں گذرتی۔ کیا ہزاروں جاہل اور کم عقل عورتیں ایسی نہیں ہیں جو اولاد کے ہر ایک مرض کو نظر گذار اور پر چھاواں اور جھپٹا اور آسیب سمجھ کر بجائے دوا کے جھاڑ پھونک اور اتار کیا کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ کل خانہ داری کا بلکہ یوں کہو کہ دنیاداری کا درس موقوف ہے عقل پر اور عقل کی علم

---

[1] مراۃ العروس بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ص ۷۹۹

پر۔اس بات کو ہر کوئی تسلیم کریگا کہ عورت میں سب سے بڑا ہنر یہ ہونا چاہئے کہ جس کے پلے بندھی ہے، آپ اس سے راضی رہے اور اس کو اپنے سے راضی اور خوش رکھے۔

مراۃ العروس میں ڈپٹی نذیر احمد نے عورتوں کی تعلیم کے بہت سارے پہلوؤں کو بیان کیا ہے اور ان کی تکمیل کے راستے بھی بتائے ہیں کہ کس طرح کس چیز کا علم حاصل ہوگا امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ ایک باوقار زندگی گذارنے کے ہنر پر بھی زور دیا ہے کہ کس طرح علم حاصل کر کے مردوں کی نظروں اور سماج کی نظروں میں باوقار ہوسکتی ہو۔اب علم حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ کسی کتاب سے زیادہ نہیں، ایک سطر دو سطر نقل کرلیا کرے اور اس قدر اپنے دل سے بنا کر لکھا کرے اور اصلاح لیا کرے اور نقل کرنے اور لکھنے میں جھجکے نہیں تو ضرور چند مہینوں میں لکھنا آجائیگا۔تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کے متعلق چند مندرجہ ذیل باتوں پر بھی زور دیتے ہیں کہ:

> ’’لکھنے پڑھنے کے علاوہ سینا، پرونا، کھانا پکانا یہ دونوں ہنر ہر ایک لڑکی کو سیکھنے ضرور ہیں کسی آدمی کو حال معلوم نہیں ہے کہ آئندہ اس کو کیا حال پیش آئیگا۔ بڑے امیر اور بڑے دولت مند یکا یک غربت اور محتاج ہوجاتے ہیں ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔‘‘ [1]

بنات النعش

مراۃ العروس کے ۴ سال بعد ۱۸۷۳ء میں ’’بنات النعش‘‘ شائع ہوئی اسے ’’مراۃ العروس‘‘ کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے ’’بنات النعش‘‘ پر تھامس ڈے (Thomas Day)

---

[1] مراۃ العروس بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ص ۸۰۶

۸۹-۱۷۴۸ کے ناول History of Sonford and Mertob (1783) کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ نذیر احمد نے بھی اپنے چالیسویں خطبۂ دہلی (۱۹۰۳ء) میں اس کا اعتراف کیا ہے:

> ''مراۃ العروس کے بعد میں نے سنڈ فورڈ کی طرح کا ایک ناول بنات النعش لڑکیوں کے لئے لکھا'' نذیر احمد نے جہاں ایک طرف تعلیم نسواں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا تھا وہاں دوسری طرف ان کو مغربی تعلیم طرز زندگی کے نقائص محفوظ سے بھی رکھنا چاہتے تھے۔ مگر عورتوں کو علوم جدید کی افادیت اور معلومات عامہ سے یکسر بے نیاز بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے چنانچہ ''بنات النعش'' میں معاشرتی زندگی سے متعلق معلومات عامہ کے مختلف پہلوؤں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس میں زندگی سے متعلق سائنسی مضامین کو بڑے دلکش پیرائے میں بنان کیا ہے مثلاً علم ثقیل، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، بجلی روشنی، ہیئت کے اصول وغیرہ سے متعلق معلومات کو قصہ کے ادب میں پیش کر کے بچوں اور بچیوں کو نئی تہذیب اور نئی روشنی کی حقیقی بنیادوں سے روشناس کرادیا۔[1]

ڈاکٹر نذیر احمد، ۱۸ ویں صدی کے اس انگریزی ناول (سینڈ فورڈ) سے متاثر ہوئے حالانکہ ان کے سامنے ۱۹ ویں صدی کے معیاری ناول یا ان کے ترجمے بھی آچکے تھے اس ناول سے متاثر ہونے کی صرف ایک ہی وجہ ہے وہ یہ کہ انگلستان کی ۱۸ ویں صدی کے حالات اور سماجی پس منظر ہماری ۱۹ ویں صدی کے اصلاحی رجحانات کے مطابق تھے یعنی جب ہمارے ادیب داستانوں اور حکایتوں کی بھول بھلیوں میں گرفتار تھے تو اس وقت وہاں ناول کی ابتدا ہو

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) — ڈاکٹر اشفاق احمد خاں ص ۵۸

چکی تھی لہٰذا نذیر احمد نے اپنی مقصد براری کی خاطر ''بنات النعش'' کا پلاٹ ترتیب کرتے وقت سینڈفورڈ کا طریقہ کار اختیار کیا اور علمی و تعلیمی مسائل کو پیش کرنے میں سینڈفورڈ کے طرز پر یہ ناول لکھا ''بنات النعش'' کا موضوع لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔ جس طرح ٹامی مارٹن ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا ہے حسن آرا بھی ایک دولت مند گھرانے کی بگڑی ہوئی بد مزاجی اور بر خود غلط لڑکی ہے۔ جس طرح ٹامس ڈے کے ناول میں تعلیم کا کام کسان کے لڑکے ہیری سینڈفورڈ سے لیا ہے یہاں بھی حسن آرا، اصغری کے میاں پڑھنے کے لئے بھیجی جاتی ہے اصغری کی نند محمودہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہاں بھی زمانی تعلیم کے ذریعہ حسن آرا میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جاتا ہے حالانکہ اسے اپنی رئیسانہ زندگی اور ماحول پر غرور تھا وہ عام لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی لیکن اصغری کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ حسن آرا میں تمام اچھی قدروں کا احساس پیدا ہو گیا اور بالآخر جب وہ اصغری کے مکتب سے رخصت ہوتی ہے تو اس کے کردار میں وہی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو ٹامی مارٹن کے کردار کے مزاج میں ہوئی تھی۔

بنات النعش میں اخلاقی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ کچھ دلچسپ معلوماتی باتیں بھی ملتی ہیں جو بچیوں کی دلچسپی کو قائم رکھی ہیں۔ حالانکہ نذیر احمد نے اپنے ناول کا خیال ٹامس ڈے سے لیا ہے لیکن اس کے باوجود ماحول اور فضا ہندوستانی ہے۔ کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور دونوں ناولوں کو پڑھنے کے بعد بھی ہم نذیر احمد کے طریق کار سے مطمئن نظر آتے ہیں اور ہم کو اس ناول کی Originality پر شبہہ نہیں ہوتا بنات النعش کی ہندوستانی فضا نذیر احمد کی اپنی دی ہوئی ہے۔ ایک انگریز عورت کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے لیکن انداز بیان اس فضا کا ہندوستانی پس منظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ سب کچھ ان کا اپنا معلوم ہوتا ہے۔[۱]

---

[۱] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) — ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۱۵۲

اس ناول میں خاص طور پرلڑکیوں کی تعلیم پرزوردیا گیا ہے چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد اس ناول کے اندر لڑکیوں کے درس وتدریس کے سلسلے میں راہ نمائی کرتے ہیں اور تمثیلی انداز میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے حسن آرا نام کی ایک لڑکی کو ناول کے مخصوص کردار میں پیش کرتے ہیں کہ حسن آرا مزاج کی اتنی خراب تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔نہ ماں کا ادب نہ آبا کا لحاظ نہ باپ کا ڈر نہ بھائیوں سے ملاپ۔نوکر ہیں کہ آپ نالا میں لونڈیاں ہیں کہ پناہ مانگتی ہیں۔حسن آرا کی ایک خالہ،شاہ زمانی بیگم ایک روز اپنی بہن (حسن آرا) کی ماں سے ملنے آتی ہیں اور اس دوران حسن آرا کی شرارتوں کو دیکھ کر اپنی بہن کی طرف مخاطب ہو کر بولیں۔''بوا سلطانہ اس لڑکی کے لئے تو از برائے خدا استانی رکھو'' چنانچہ محلے میں ہی مولوی محمد فاضل کی چھوٹی بہو کو استانی کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے۔چنانچہ جب حسن آرا اپنی اسناتی کے گھر پڑھنے کے لئے گئی وہاں بھی اپنی ساری کلاس فیلو کی پریشانی کا باعث بنی اس لئے کہ گھر کے اندر جس طرح اپنی ساری ملازموں سے وہ بداخلاقی کا برتاؤ کرتی تھی جس طرح وہ مغرور تھی اور اپنی ضد کے آگے کسی کا بھی پاس ادب نہیں تھا اسی طرح وہ اپنے کلاس فیلوس کے ساتھ بھی بداخلاقی سے پیش آتی تھی یہاں تک کہ ایک دن اپنی استانی محمودہ بیگم سے ایک لڑکی زبیدہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کیوں بوا، یہ سامنے والی چیچک رولڑکی طباق کی روٹی کا سامنہ لئے ہوئے کون ہے؟ کہہ کر حسن آرا آپ ہی آپ ہنسی اور اس امید سے کہ محمودہ بھی ایسی پھبتی سن کر پھڑک جائے گی،محمودہ کا منہ دیکھنے لگی۔ یہاں محمودہ پر اس کا الٹا اثر ہوا۔منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر حسن آرا کی بات کو اس قدر حقارت سے سنا کہ اس کے چہرے سے یہ بات ظاہر ہوگئی اور بے رخ ہو کر جواب دیا کہ امیر خاں کی حویلی میں رہتی ہیں۔زبیدہ ان کا نام ہے۔ان کے ابّا رفو کا کام کرتے ہیں۔

حسن آرا: اچھی، کیسے رفو گر ہیں، بیٹی کے چہرے میں پاؤ بھر قیمہ لے کر رفو ہی کرتے؟
محمودہ: بیٹی چیچک پھٹ ہے، منہ پھٹ ہوتی تو رفو کرتے۔

اس طرح حسن آرا نے اور دو چار پھبتیاں کہیں تو محمودہ نے کچھ داد نہ دی آخر حسن آرا کھسیانی سی ہو کر اپنا سا منھ لیکر رہ گئی۔

ادھر استانی کا اس کا اہتمام ضرور تھا کہ حسن آرا کو مکتب سے بے دلی نہ ہونے پائے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اگر حسن آرا ایک بار بدل ہوگئی تو دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے وہ مکتب میں نہیں آئے گی۔ نفسیاتی طور پر ڈپٹی نذیر احمد نے حسن آرا کو راہ راست پر لانے کا کام کیا چنانچہ اصغری بیگم (استانی) کے ذریعہ تمام لڑکیوں کو اشارہ کر دیا کہ حسن آرا بہت اچھی لڑکی ہے اور بڑی عمدہ سہیلی تم کو ہاتھ لگی ہے تھوڑے دن صبر کر و اس کو بد دل نہ ہونے دو۔

غرض ادھر تو لڑکیاں دلداری پر آمادہ ہوئیں، اُدھر استانی جی نے پڑھنے لکھنے کا نام تک منہ سے نہ نکالا۔ پھر حسن آرا کی وحشت کی کیا وجہ تھی؟ تھوڑے ہی دنوں میں لڑکیوں سے ایسی بے تکلف ہوگئی کہ مدتوں ساتھ کھیلی ہوئی ہے اور خود فرمائش اور تقاضا کر کے محمودہ کی گڑیاں کھلوائیں۔

اب جب کہ حسن آرا ذہنی طور پر محمدہ کی گرویدہ ہوگئی تو استانی جی نے لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ کیا اور دیگر اخلاقی باتوں کی طرف حسن آرا کی مبذول کیا چونکہ حسن آرا ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی دولت کے نشہ میں چور رہتی تھی ہر چیز کو دولت کی روشنی سے دیکھنے کی عادی تھی اس کا خیال تھا کہ دولت سے دنیا کی ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناصحانہ انداز میں حسن آراء کی تربیت کرنی شروع کی اور حسن آراء کی بھی ایک کلاس فیلو نے محمودہ کے ذریعہ دولت کی اہمیت اور دیگر اشیاء کی اہمیت کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور ان دونوں کی لمبی بحث کے بعد حسن آرا کو

اس بات پر آمادہ کیا کہ دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی دولت کے سبب آدمی آرام طلب ہو جاتا ہے اور دن بہ دن کمزور ہوتا جاتا ہے آدمی خود اپنے ہاتھ سے کام کرے تو سارے اعضاء صحت مند رہتے ہیں اور صحت کے اعتبار سے بھی آدمی توانا اور تندرست رہتا ہے۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے بنات النعش ناول کے اندر انسانی زندگی سے متعلق خاص طور پر لڑکیوں سے سابقہ پڑنے والے تمام پہلوؤں پر بہت ہی گہرائی سے اپنے فکر اور تجربہ کو پیش کیا ہے چنانچہ تمدن کی وجہ اور اس کے بارے میں وہ بہت ہی پر مغز بحث کرتے ہیں اور اس سلسلے میں حسن آرا کے ذریعہ بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

حسن آرا: سب لوگ ایک جگہ کیوں نہیں رہتے ایک بڑا شہر بسا لیں اور سب لوگ اس میں رہیں تو بڑا مزہ ہو۔

محمودہ: مزہ کیا خاک ہو سب بھوکے مرنے لگیں۔

حسن آرا: کیوں؟

محمودہ: کھانے کا اناج میدان میں پیدا ہوتا ہے اس سبب سے لوگ دنیا میں الگ الگ بستے ہیں۔ ہر ایک بستی کے آس پاس کچھ میدان جوتنے اور بونے اور اناج پیدا کونے کے واسطے لگار کھتے ہیں سب ایک ہی جگہ رہیں تو ہزاروں کوس کا لمبا شہر ہو جایئے پھر جوتنے بونے کس کے یہاں جائیں ولایت میں تو لوگ صرف چار پانچ گھر بنا کر رہتے۔

حسن آرا: مزہ آتا ہوگا۔

محمودہ: ہم سب سے بہتر طور پر گذر کرتے ہیں۔

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد۔ ڈپٹی نذیر احمد ص ۴۸۴

حسن آراء: خاک گذرتے ہونگے حلوائی نہ عطاّ نہ گندہی نہ سہار نہ بزار۔

محمودہ: یہ چیزیں امیرانہ زندگی کے لایعنی تکلفات اور شیخی اور نمود اور ڈنیگ کے بیہودہ سامان ہیں۔ ان کو داخل ضروریات زندگی کون کہتا ہے پیٹ بھر لینے کو کچھ ڈال دل لیا۔ کچھ غذا چاہئے اور تن بدن دھک لینے کو موٹا چھوٹا کپڑا بس۔ اس کے علاوہ سب انسان کی خود نیتی اور تن پروری اور آرام طلبی کے ڈھکوسلے ہیں سو جو چیزیں ضروری ہیں وہ گاؤں والے پیدا کر لیتے ہیں۔ [1]

بنات النعش کے درمیانی حصے میں معلومات عامہ کا ایک انبار لگا دیا گیا ہے اس کے متعلق مسٹر کیمپس ڈائریکٹر پبلک آف انسٹرکشن لکھتے ہیں:

> ''جو بیانات ان مضامین میں لکھے گئے ہیں ان سے میرا خیال آرچ بشپ وہٹلے کی کتاب کے آسان مباحث کی طرف رجوع ہوتا ہے جس سے ہمارے مدارس دستور المعاش کے نام واقف ہیں۔'' [2]

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ نذیر احمد نے غریبوں کے ساتھ رحم دلی اور ہمدردی کا جذبہ ابھارنے کے طریقے ''تھامس ڈے'' سے مختلف طور پر اختیار کیا تھا ''ڈے'' واقعات کے بیان سے نیگرو اور غریبوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کی جذبہ ابھارتا ہے۔ بنات النعش کا اصل مقصد حسن آرا کی درستگی اور اس کی تعلیم ہے۔ نذیر احمد نے دو قسم کے ماحول کے ٹکراؤ سے حسن آرا کے ذہن کو بدلنے کام کا کیا ہے اس لئے ماحول میں اس کے غرور و نخوت پر قدم قدم پر

---

[1] بنات النعش۔ڈپٹی نذیر احمد ص ۷۶

[2] بحوالہ حیات النذیر ص ۱۸۱

چوٹ پڑتی ہے حسن آرا کے دل میں مکتب کی لڑکیوں کے تمام فن کو جلد دے جلد سیکھ لینے کا زبردست جذبہ پیدا ہوتا ہے جسے بہترین گڑیاں بنانا، عمدہ سلائی کا کام، اور اسی طرح اس کے دل میں یہ جذبہ بھی ابھرتا ہے کہ وہ بھی اپنے ہاتھ سے کھانا پکائے گی۔

حسن آرا کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک امیرزادی ہونے کی حیثیت سے کسی نے اس سے اچھی گڑیا بھی دیکھی ہوگی یہاں اس کے غرور کو زبردست دھکا لگایا۔ نذیر احمد نے یہاں فطرت نگاری کا کمال کر دیا ہے۔ حسن آرا کے استعجاب کی معراج کو اس بلا کی دلکشی کے ساتھ وہ پیش کر دیتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "غرضیکہ محمودہ کی گڑیاں کو دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہوئی تھی کہ تعجب ہو ہو کر محمودہ کو ہی دکھاتی ہے۔"[1]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نذیر احمد نے بنات النعش کی تصنیف میں زیادہ محنت سے کام لیا ہے فنی اعتبار سے زیادہ بلندی پر نظر آتے ہیں اس ناول میں نذیر احمد نے مسلم بچیوں کی مکمل گھریلو تعلیم کا خیال دیا ہے وہ عورتوں کو اس کے ذریعہ معلومات عامہ سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا اور حساب و کتاب کے متعلق بھی بتاتے ہیں لیکن اس میں سب سے زیادہ زور امور خانہ داری کی چیزوں پر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر عورت کے لئے اتنی تعلیم سے بہرہ مند ہونا ضروری خیال کرتے تھے، گھر اور عورت کا جو قدیمی اور اہم رشتہ تسلیم کیا گیا ہے وہ اسی کے لئے ذرا نئے ڈھنگ سے عورتوں کو تیار کرتے ہیں وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی نفی بھی نہیں کرتے۔

نذیر احمد کا یہ طریقہ تعلیم اور امور خانہ داری کا یہ جدید انتظام بھی مغرب ہی کا

---

[1] بنات النعش باہتمام محمد مسلم ایم۔اے ص ۱۹

مرہونِ منت ہے اس زمانے میں ڈپٹی نذیر نے عورتوں کی تعلیم کے حق میں جو قدم اٹھایا اس زمانے کے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں دہلی والے کس قدر خلاف تھے اس کے متعلق مراۃ العروس میں ثبوت پیش کیا جا چکا ہے۔ نذیر احمد نے قدیم سے قدیم مسلم معاشرہ سے واضح طور پر انحراف کیا ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس وقت کے ہندوستان سے ہوسکتا ہے سر سیدؒ بھی کچھ لوگوں کے لئے عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں تھے لیکن نذیر احمد بر وقت اس مسئلے کو چھیڑ دیا۔ یہ ان کی انفرادی حیثیت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے اور ان کے اس نقطۂ نظر کو ظاہر کرتا ہے کہ ذات، ہر طبقہ اور ہر صف کی ترقی یکساں طور پر ہونی چاہیے، اسی سے ایک قوم کی بجا طور پر خود کفیل ہوسکتی ہے۔ بنات النعش کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہ لحاظ قصہ بنات النعش بہت سادہ اور پھیکی ہے اور اس میں موعظتی رنگ، سطر سطر میں اس طرح نمایاں ہے کہ اس کا تا دیر پڑھتے رہتا ہے قریباً ناممکن ہے۔ استانی جی کی زبان سے نذیر احمد یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ اس کتاب میں تم مکتب کی سب لڑکیوں کی ہو بہو تصویر پاؤ گی اور تصویر سے مراد یہ ہے کہ مزاج، تمہاری خو کو بو ـــــ لیکن افسوس ہے کہ نذیر احمد کی تصویر میں ایک ماتم خانہ کی تصویر ہیں۔'' [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے ایک مکتب کا نقشہ کھینچا ہے وہ بھی لڑکیوں کی چھوٹی سی درسگاہ کا نقشہ، اس میں مرد کا عمل دخل بالکل جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ مکتب کی لڑکیوں کے مزاج، عادت واطوار کا بڑی حد تک پتہ چل گیا ہے مکتب کے بچوں کا ہر فعل ماسٹروں کے تابع ہو جاتا ہے اور مدرسہ میں

---

[1] سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص ۲۶۶-۲۶۷

استاد کچھ اصلاح کی باتیں اور کچھ نصیحتیں کرتا ہی ہے۔ نذیر احمد نے اس کو زیادہ دلکش پیرائے پیش کیا ہے اس کا کینوس بہت ہی محدود ہے حالانکہ بنات النعش ایک پوری کہانی کا چربہ ہے وہ تصنیف ''ڈے'' کی مکمل تصنیف مانی جاتی ہے اس لئے نذیر احمد کی تصنیف بھی ایک مکمل تصنیف کہی جا سکتی ہے۔ نذیر احمد کے اس ناول میں حکومت کے اسلوبی نظام تعلیم کی در پردہ مخالفت ہوتی ہے یہ ناول حکومت کے تعلیمی اسکیموں کے برخلاف ایک دوسرے قسم کے نظام تعلیم کی تلقین کرتا ہے۔ یہ گھریلو تعلیم کی ترقی یافتہ شکل ہے اس وقت لڑکیوں کی اسکول بھیجنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ دلی جیسی جگہ میں بھی لڑکیوں کی تعلیم بالکل ہی کم تھی۔ ہزاروں میں ایک دو پڑھی لکھی مل جاتی تھیں۔ اس ناول کے اندر ڈپٹی نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا طریقہ بتایا ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا۔

احسن فاروقی اس ناول کا اس انداز میں جائزہ لیتے ہیں:

> ''اس میں جو طرز تعلیم دکھایا گیا ہے اس کو Play way کہتے ہیں، مولانا بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ اس وقت جب کہ تعلیم نسواں کافی رائج ہوگئی ہے، اس کتاب کی اہمیت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی لیکن مولانا کے زمانے میں جب کہ اسکول بھیجنا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا، یہ کتاب ایک گھریلو لڑکی کو عام تعلیم و رتربیت بہم پہونچانے کا مکمل نسخہ ضرور تھی، اس وقت بھی اسکول کی تعلیم کی خامیوں کو یہ کتاب شاید پورا کر سکے۔'' [1]

بنات النعش کی فضا لڑکیوں کے اسکول کی فضا سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے اس ناول کے اندر ڈپٹی نذیر احمد نے قدیم تعلیم کے طریقہ پر بے باک تبصرہ کیا ہے اور مختلف

---

[1] اردو ناول نگاری کی تنقیدی تاریخ ص ۳۱۔۳۲

موضوعات پر مباحثے بھی ملتے ہیں شہر اور دیہاتی زندگی کا ایک عمدہ موازنہ اس میں شامل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر اپنے ناول کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسی نہیں چھوڑی۔ نذیر احمد نے اپنے ناول میں بچوں پر مشتمل ایک جہاں تو تخلیق کیا ہے ڈپٹی نذیر احمد کا خیال تھا کہ مشفق اور مہربان استانیاں بچیوں کو آسانی سے تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کر سکتی ہیں۔

نذیر احمد نے ''ڈے'' کی اخلاقی کہانی کو مسلم معاشرے اور جدید رجحانات کے باہمی اتصال سے جو فضا تیار کی ہے ایک طریقے سے زندگی بخش دی ہے۔ اس ناول میں براہ راست اخلاقی درس دینے لگے جب کہ نذیر احمد ایک مقصدی ناول نگار ہیں نذیر احمد نے اپنے مشاہدے اور فنکارانہ صلاحیتوں کی مدد سے انھیں باتوں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ نہ صرف ہم ان کی باتوں سے بہل جاتے ہیں بلکہ اس کی حقیقتوں کے سامنے اپنا سر خم کر دیتے ہیں۔ نذیر احمد اپنے دور کے اعلیٰ ناول نگاروں سے واقف نہیں تھے اگر ہارڈی، دکنس جین آسٹین، ٹالسٹائے جیسے ناول نگار پڑھنے کے لئے مل گئے ہوتے تو وہ اپنے اصلاحی مقاصد کو اور زیادہ فنکارانہ انداز میں پیش کر سکے اور اپنی اخلاقی تعلیم کو زندگی کی اہم قدروں کی شکل میں اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے۔ [1]

نذیر احمد نے لڑکیوں کی گھریلو تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تھوڑی سی تعلیم کا اہتمام کیا ہے چنانچہ زمین کی کشش، کہ کس طرح زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچی ہے۔ وزن مخصوص، ہوا کا دباؤ کاشش اتصال، مقناطیس (جو ایک طرح کا لوہا ہوتا ہے جو دوسرے لوہے کو اپنی طرف کھینچتا

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص۔ ۱۶۶

ہے) اس طرح زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ خرد بین، رنگ، جس کے بارے میں نذیر احمد لکھتے ہیں کہ رنگ اصل میں تین ہی ہیں۔ زرد، سیاہ، سرخ اور باقی سب رنگ انہیں رنگوں سے بنتے ہیں جیسے زمین گول ہے۔ اس طرح عام جغرافیہ کا علم، کرہ زمین کا نقشہ مع حالات عامہ۔ ایشیا، یورپ، افریقہ کے نقشہ جات، سمندر کے منافع، اور مینہ، بجلی بادل وغیرہ اور روشنی اور ہوا کی رفتار، علم تاریخ کا تذکرہ اور آدمیوں کی مختلف رسمیں حتیٰ کہ اپنے اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے علم ہیئت، چاند گہن سورج گہن تک ذکر کیا ہے۔ گویا اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے قدیم تعلیم کے رسم ورواج کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی ہے اس طرح لڑکیوں کی تعلیم کا ایک نقشہ اس کتاب میں پیش کیا ہے جو ہر دور میں اپنے افادی پہلو کا حامل رہے گا۔

اس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے لڑکیوں کے خوبصورت مستقبل اور خوشحالی ازدواجی زندگی کے ہنر سکھائے ہیں کہ کس طرح ایک لڑکی تعلیم حاصل کر کے خود کو اور اپنے خاندان کو ایک کامیاب اور خوشحال زندگی دے سکتی ہے۔

توبۃ النصوح

ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے دور کے ناولوں میں توبۃ النصوح کا بھی شمار ہوتا ہے اس کی اشاعت پہلی بار ۱۸۷۴ء میں ہوئی تھی اور دوسری بار ۱۸۷۷ء میں یہ ناول شائع ہوا تھا۔

ایم کیمپسن صاحب کے ایک خط مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۷۳ء سے یہ واضح ہوتا ہے کہ توبۃ النصوح ۱۸۷۳ء کے اوائل میں لکھی جا چکی تھی۔ اس خط میں کیمپسن نے لفٹنٹ گورنر میور صاحب کی توجہ توبۃ النصوح کی طرف مبذول کرائی ہے، اس ناول کے فائدے گنائے گئے ہیں اور انعام اول مبلغ ایک ہزار روپے کے لئے سفارش کی ہے اس کی تصحیح بعد تک ہوتی رہی جس کی

توثیق توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء (نول کشور کانپور) کے ایڈیشن سے ہوتی ہے۔[1] اس کی اشاعت اس کے ایک سال بعد مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۷۴ء میں ہوئی ہے [2] بعض نقاد اس کی اشاعت کا سال ۷۷۔۱۸۷۶ء بتاتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

اس کے موضوع کے متعلق نذیر احمد نے خود ہی تربیت اولاد بتایا ہے۔ کیمپسن نے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کو نینی تال سے ۱۱ر ستمبر ۱۸۷۳ء انعام اول کی سفارش کرتے ہوئے اور توبۃ النصوح کی افادیت سے بحث کرتے ہوئے جو چھٹی لکھی تھی اس کے مطابق اس ناول کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱- بے دینی کی خرابیاں

۲- لڑکیوں کا ابتدائی عمر میں تعلیم پانا اور والدین کا نیک ہونا، اچھے چال چلن کی بنیاد ہے۔

۳- عورت کو تعلیم کی ضرورت، صالحہ کی نیکی، اور نعیمہ کے جہل سے خوب ظاہر کی گئی ہے۔

۴- صحبت نیک اور کتب پسندیدہ کا نتیجہ، نوعمر لڑکیوں کی اوصاف کی درستی کے باب میں

۵- اخلاق کی نسبت صحبت بد کی قباحت اور معمولی کتب خوانی کی مضرت۔ [3]

نذیر احمد نے تربیت اولاد سے مراد تہذیب اخلاق اور اطوار لیا ہے وہ زندگی کی چند صحت مند اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف مذہبی امور پر زور دیتے ہیں لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ عمدہ اخلاق تہذیب اور اچھی قدروں کے لئے

---

[1] توبۃ النصوح مطبوعہ ۱۸۸۷ء (نول کشور کانپور) ص ۱۲

[2] توبۃ النصوح مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۷۴ء (یہ ایڈیشن عظیم الشان صدیقی صاحب کے یہاں دستیاب ہے)

[3] توبۃ النصوح ۱۸۸۷ء نول کشور کانپور ص ۱۲

سرگرداں ہیں ان کے نزدیک اگر پادری سے بھی اچھے اخلاق عادت واطوار اور نیک طبیعت کی تربیت ہوتی ہے تو اس سے استفادہ کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے حالانکہ وہ مذہب سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے لئے تیار نظر نہیں آتے اسی لئے وہ اپنے مذہب کی پابندی پر پورا زور دیتے ہیں۔ مذہب سے الگ وہ نیکی کا تصور نہیں کر سکے چنانچہ نصوح کے خواب سے حشر کے حساب کتاب سے مذہبی ماحول کو تیار کرتے ہیں اس کے بعد نصوح کا بدلا ہوا انداز فکر اور اپنے تئیں آخرت کا خوف اور فکر خاندان کے تمام لوگوں کی آخرت کی فکر اور ایک نیک جذبہ خواب سے بیداری کے بعد اس کے ذہن میں ابھرتا ہے دراصل شہر میں ہیضہ کی وبا پھیلی اور نصوح کو اس بیماری نے اپنی گرفت میں لے لیا ہیضہ کی وجہ سے نصوح بہت ہی نقاہت محسوس کر رہا تھا اور اس کمزوری کی حالت میں اس کو نیند آ گئی اور نیند ہی کی حالت میں اس کو خواب آیا اور خواب میں روز حشر اور آخرت کے حساب و کتاب نظر آئے اور خواب سے بیدار ہونے کے بعد اس نے اپنے ساتھ ساتھ گھر کے تمام لوگوں کی اصلاح کا منصوبہ بنایا اور اپنی اولاد کی تربیت کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ توبۃ النصوح کے دیباچہ میں نذیر احمد تربیت اولاد پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''بلکہ ان کے اخلاق کی تہذیب، ان کے مزاج کی اصلاح، ان کی عادت کی درستی، ان کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے، افسوس ہے کہ کتنے لوگ اس فرض سے غافل ہیں —— یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرائے گی کہ تربیت اولاد ایک فرض وقت ہے یعنی لڑکے جب تک کم سن یعنی صغیر ہیں، تربیت پذیر ہیں اور بڑے ہوئے، پیچھے ان کی اصلاح مشکل یا مستعدز بلکہ محال ہو جاتی ہے۔'' [1]

---

[1] توبۃ النصوح (دیباچہ) ص ۲۰

ڈپٹی نذیر احمد ناول کے ذریعہ خواب کے حوالہ سے اصلاح کا کام لیتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ توبۃ النصوح کو خواب میں بہت ساری نصیحتیں کی گئیں یہاں تک کہ خواب میں اللہ تعالیٰ نے اس کی حقیقت وعقیدت کو دیکھایا کہ تمام عقیدت معلوم ہو کہ اوپری دل سے تھی دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اتنی مہربانی سے عطا کیا تھا۔ تو نے اس کو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی اگر چہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاری مارا کرتا تھا۔ مگر کیا تو اس کا الزام ہماری ذات مجتمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان ہم نے تجھ پر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منھ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر! بے شمار نعمتیں ہم نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا ہم نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو ہماری مخالفت پر کمر بستہ رہا۔ جتنی ہم تیری رعایت کرتے رہے، اسی قدر تو گستاخ وشریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو گھمنڈ ہو گیا کہ تو اپنی تئیں ہماری خدائی سے باہرے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا ہم نے تجھ کو نیست سے ہست کیا اور خلعت انسانیت سے سرفراز کیا جو کچھ تجھ کو درکار تھا، سو تجھ کو دیا جس کا تو حاجت مند تھا سب مہیا کیا، ہر حال میں تیرے محافظ ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے کیا اسی واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے؟ جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا، ضعیف ولایعقل، نادان و جاہل، ضعیف اتنا کہ نقل وحرکت پر قادر نہیں، نادان ایسا کہ خویش و بیگانہ کا امتیاز نہیں۔ ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیری ماں باپ، تیری خدمت گذاری کو مقرر کیے ان کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا اور تو روز بروز خوشحال اور خوشحال ہوتا گیا۔

ڈپٹی نذیر احمد انسانی زندگی کا پیدائش سے لیکر بڑے ہونے تک کا سارا نقشہ شریعت کے دائرہ میں کھینچ کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور انسانی نفسیات اور انسان کی خود فراموشی، اور اپنے عمل و کردار کی کوتاہی اور فرائض سے روگردانی کو ایک ایک کرے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس واسطے پیدا کیا اور زندگی گذارانے کا اپنا ایک اصول بتایا جیسا کہ توبۃ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

> ''ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت تاکید کی تھی کہ روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھکو بہت ہی عزیز ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے۔ دیکھ اس کی حفاظت کما حقہ کیجیو جیسا اجلا، شفاف، براق، روشن یہاں سے لیے جاتا ہے۔ ایسا ہی دیکھ لوں گا۔'' [1]

خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے خاندان کی لایعنی زندگی پر سخت تاسف ہوا اور اس نے تلافئ مافات کا عہد کر کے فہمیدہ، اپنی بی بی، سے ماجرائے خواب بیان کیا اور اصلاح خاندان کے لیے اس کو اپنا مددگار بنایا اور پھر خاندان کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ بی بی بچے سب ایک رنگ میں ہیں دنیا میں منہمک، دین سے بے خبر۔ تب یہ دوسرا صدمہ نصوح کے دل پر ہوا کہ واحسرتا! میں تو تباہ ہوا ہی تھا میں نے ان تمام بندگان خدا کی بھی باٹ ماری، اپنی شامت اعمال کیا کم تھی میں اپنے ان سب کا وبال سمیٹا۔ مگر اصلاح خاندان ایک بڑا مشکل کام تھا وہ بخوبی وقف تھا کہ دین داری اور خدا پرستی میرے خاندان کے لیے بالکل نئے الفاظ ہیں جن سے چھوٹے بڑے کسی کے کان آشنا نہیں وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گھر بھر ایک طرف ہوگا اور میں ایک طرف۔ پس وہ غور

---

[1] توبۃ النصوح بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی نذیر احمد ص ۲۸۸

کرنے لگا کہ کس کو اپنا مددگار بنائے' کس کو صلاح کار قرار دے چنانچہ اس نے بی بی کو اپنا مددگار بنانا منظور کیا اور اس وقت نصوح کو بی بی کا پڑھا ہونا بہت غنیمت ہوا اور سمجھا کہ بی بی یوں ہی خدا کے فضل سے اسم با مسمّٰی فہمیدہ ہے اور نصوح نے مصمم ارادہ کرلیا کہ ان شاءاللہ اپنے مقدور بھر کوشش کروں گا یا تو راہ راست پر آئیں گے یا جیتے جی چھوڑ دوں گا۔لیکن اس کا ارادہ مستحکم تھا کہ کوئی مشکل اس کو روک نہیں سکتی۔وہ مضطرب اور مستعجل اس قدر تھا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمالوں۔

چنانچہ ابھی اچھی طرح بدن میں قوت نہیں آئی تھی کہ اس نے بی بی سے کہا کہ ''تھوڑا سا پانی گرم کرا دو کہ میں نہالوں۔''

بی بی نے کہا کہ ''تھوڑا سا اور آرام کر لیجیے جب تھوڑا ہاتھ پاؤں میں دم آ جائے خیر سے چلنے پھرنے لگو تو نہا لیجیے گا ابھی کونسا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

نصوص نے کہا کہ ''مجھے نماز پڑھنی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد غسل کر کے نماز پڑھ لوں۔''

نماز کے متعلق جب بی بی نے سنا تو ایسا تعجب ظاہر کیا کہ نصوح پر گھڑوں پانی پھر گیا اور اس نے کہا کہ اللہ اللہ دین سے اتنی دوری کہ لوگ نماز پڑھنے کو سن کر تعجب کر رہے ہیں اور گھر والے تعجب کرتے ہیں۔غرض بیوی کے منع کرتے کرتے نصوح نے غسل کر کپڑے بدل نماز پڑھی۔ آج نصوح کی یہ پہلی نماز تھی جس کو داخل عبادت کہہ سکتے ہیں۔بیماری سے پہلے اس کی بدمزاجی گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے والے بھی جانتے تھے۔بات بات پر بچوں کو جھڑکنا، ذرا نمک کم ہو جانے پر کھانا پھینک دینا، رکابیوں کو توڑ دینا عام بات تھی۔اب حالت یہ ہے کہ نصوح کے سر پر ڈھول بجاؤ کچھ خبر نہیں۔

شروع شروع میں نصوح کے یہ انداز دیکھ کر گھر والوں کو بڑا کھٹکا تھا وہ جانتے تھے کہ بیماری سے اٹھے ہیں ضرور پہلے سے زیادہ نازک مزاج ہوں گے لیکن اب یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جو رکھ دیا سو چاؤ سے کھالیا، جو دے دیا خوشی سے پہن لیا نہ حجت و تکرار۔ نصوص کی عادت بدلی تو لوگوں کی مدارات بھی اس کے ساتھ بدل چلی وہ اب اس کا ادب ملحوظ رکھتے جس کو وحشت و نفرت تھی وہ اب اس کے ساتھ انس و محبت کرتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں گھر شور و شغب سے پاک اور لڑائی جھگڑے سے پاک ہوگیا۔ [1]

ابتدا میں نصوح کا نماز پڑھنا دیکھ کر گھر والوں کو بہت تعجب ہوتا تھا مگر پھر سے کہے دوسروں پر ایک اثر سا ہونے لگا اور نصوح اسی کا منتظر تھا کہ اس طرز اجنبی سے کس قدر مانوس ہوں تو اپنا کام شروع کروں۔ چنانچہ نصوح نے پہلے اپنی بیوی کو اپنا محرم بنایا اور پھر میاں بیوی دونوں نے دعا کے واسطے ہاتھ پھیلا دیئے اور گڑگڑا کر اپنے اور دوسرے کے گناہوں کی مغفرت چاہی۔ اس کے بعد فہمیدہ مسرت و اطمینان کی سی باتیں کرنے لگی مگر نصوح کی افسردہ دلی بدستور باقی تھی کہ کس طرح میں نے اپنے بچوں کو غارت کیا۔ میری دیکھا دیکھی یہ بھی گئے گزرے ہوئے۔ افسوس! سن تمیز کو پہنچنے سے پہلے یہ یتیم کیوں نہیں ہو گئے۔ شیر خوارگی ہی میں میرا سایہ زبوں ان کے سر پر سے کیوں نہیں اٹھا لیا گیا کہ دوسرا ان کی تربیت کا متکفل ہوتا جو اپنی خدمت کو مجھ سے بدرجہا بہتر انجام دیتا۔

غرض کچھ اس طرح کے بے سُرے بچے ہیں ناہموار، آوارہ، بے تمیز، بے حیا، بے غیرت، بے ہنر، بدمزاج، بدزمان، بدوضع کہ چند روز سے دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترتا ہے۔

---

[1] توبۃ النصوح بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی نذیر احمد ص ۲۹۸

ان کی حرکات وسکنات، نشت و برخاست کوئی بھی تو بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ مگر پھر دیکھتا ہوں تو ان کا کچھ قصور بھی نہیں۔ خطا اگر ہے تو میری اور تمہاری ان کے عیوب پر جھڑکنا اور ملامت کرنا کیسا، ہم نے کبھی ان کو روکا تک بھی تو نہیں۔

غرض میاں بیوی میں طرح طرح مشورے ان کی اصلاح کے متعلق ہوئے اور بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر واقعی ہمیں اپنے بچوں کی اصلاح کرنی ہے بہت ہی نرمی کے ساتھ ان کو سمجھانا ہوگا اس لیے کہ زمانہ کے بگڑے لڑکے یکدم میں آن کی آن نہیں سنبھل سکتے۔ نصوح نے کہا کہ بھئی ان کی اصلاح میں تو اس شعر پر عمل کروں گا ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چوں رگ زن کی جراح مرہم نہ است[1]

چنانچہ نصوح فہمیدہ (نصوح کی بیوی) اور تین بچے حمیدہ، علیم اور سلیم کو نصوح بہت جلد اپنی طرح دیندار بنالیتا ہے۔ نعیمہ بھی کچھ تاخیر سے اپنے خالہ کے گھر جا کر نیک خو اور دیندار بن جاتی ہے گویا نصوح اپنے کمسن اور معصوم بچوں کی اصلاح کرنے میں بعافیت گذر جاتا ہے لیکن باشعور بچوں کے سلسلے میں اس کی ہر قسم کی کاوشیں بے کار ثابت ہوتی ہیں چنانچہ کلیم اور نعیمہ کو اپنے باپ کی اصلاحی کاروائیاں اور سخت گیریاں ایک جنون معلوم ہوتی ہیں اور ان کا یہ خیال صورت حال کے مطابق ہے۔ کلیم نصوح کا سب سے بڑا بیٹا ہے جو بچپن سے بڑے ناز ونعمت، لاڈ اور پیار میں پلا بڑھا اور ہر فکر سے آزاد رکھا گیا۔ اس رؤسا اور امرا کے تمام طور طریق، عادتیں اور خصلتیں موجود ہیں۔ شعر وادب اور دوسرے فنون لطیفہ کا دلدادہ ہے۔ سیر وتفریح، کھیل کود اور یار باش اس کا مزاج

---

[1] توبۃ النصوح، ڈپٹی نذیر احمد ص ٦٦

بن چکی ہیں۔ جاگیردارانہ ذہنیت کے ساتھ ہی طبیعت میں سادگی اور بھولا پن بھی ہے مگر عاقبت سے بے نیاز ہے۔ اس کی طبیعت میں ضد بھی ہے اور خوداری بھی یعنی جس چیز کا وہ قائل نہیں وہ کسی کے جبر سے ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ نصوح تمام گھر کو اپنی طرح مفید اور پرہیزگار بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن کلیم کو راہِ مستقیم پر لانا اس کے لیے بڑا مشکل تھا اس لیے کہ اس کی عادتیں، ان کی طبیعت بن چکی ہیں اور ان کا تبدیل ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ کلیم کہتا ہے:

> ''میرے نزدیک صرف دس بارہ برس کی عمر تک اولاد محتاج تعلیم ہو اس کے بعد ماں باپ کو ان کی رائے میں چکھ دخل نہیں وہ اپنے نقصان خود سمجھ سکتے ہیں۔ اگر یہی منظور تھا کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا ملا یا قبرستان کا قرآن خواں یا لنگر خانہ خیراتی کا ٹکڑا بنوں گا تو شروع سے مجھ کو ایسی ہی تعلیم کی ہوتی کہ اب تک بھلا کچھ نہیں تو میں دو چار حج ہی کر آیا ہوتا۔ پنچایت میں میری دھوم ہوتی، تراویح میں میرے لہجہ قرآنی کی شہرت اُڑتی، کہیں مردہ مرتا جائے نماز مجھ کو ملتی، کہیں قربانی ہوتی کھال میرے پاس آتی، صدقے میں اڑھیتا ہوتا، زکوٰۃ کا ٹھیکیدار، دعوتوں کا مستحق، خیرات کا حق دار، نہ یہ کہ پڑھاؤ کچھ کا پوچھو کچھ کا، سکھاؤ اور چیز اور امتحان لو دوسری چیز میں...... میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیر زادوں کا وہ کونسا ہنر ہے جو مجھ کو نہیں آتا۔'' [1]

کلیم کی یہ گفتگو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بچپن میں بچوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس کا اثر پوری زندگی رہتا ہے۔ کلیم نے ابتدا سے ہی شاعری، یار باشی، آرائش و زیبائش، فضول خرچی اور کھیل کود کے مشاغل میں گذاری۔ اب وہ سیانا اور باشعور ہے اب اس پر پرہیزگاری،

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۸۸

دین داری کی تلقین وتادیب اثر نہیں کر سکتے۔ نصوح اس نفسیات سے قطعی بے خبر نظر آتا ہے۔ اب چوں کہ کلیم ضدی اور فطرتاً ناعاقبت اندیش بھولا اور معصوم واقع ہوا ہے یہاں تک کہ خوشامدیوں کو اپنا عزیز سمجھتا ہے حالاں کہ اپنے چھوٹے اور مکار دوستوں کی وجہ سے وہ کئی بار مشکلات میں پڑا ہے اس کے بعد بھی وہ نصوح کے سمجھانے پر راہ راست پر آنے کو آمادہ نہیں۔ وہ اپنی آزادی سے دوست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کو اپنی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے جس نے اسے برخود غلط بنادیا۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول توبۃ النصوح کے ذریعہ اولاد کی پرورش کے سلسلے میں تمثیلی انداز میں جو کہانی پیش کی ہے اس کو پڑھنے کے بعد واقعتاً والدین کو اپنے بچوں کی تربیت میں بڑی آسانی معلوم ہوتی ہے۔ اس ناول کے اندر نصوح کا بڑا بیٹا کلیم بار باش اور طرح طرح کے کھیلوں کا عادی تو تھا ہی اور خوشامدی بھی۔ چنانچہ اسی عادت کی وجہ سے ان کے حلقۂ احباب میں مرزا ظاہر دار بیگ کا نام بھی آتا ہے جو نہایت چالاک، شاطر اور عیار شخص ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کس قدر ہوشیاری کے ساتھ انسانی فطرت کا نقشہ ظاہر دار بیگ اور کلیم کی شکل میں پیش کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح اور کس خوبی کے ساتھ نصیحت کرنے کا پہلو اور اصلاح کا راستہ نکال لیا ہے جو کہ اچھے اچھے ناول نگاروں کو میسر نہیں ہوسکا۔ مرزا ظاہر دار بیگ توبۃ النصوح کا سب سے مضبوط کردار ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت انسانی کا ایک نمونہ ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کو ایک خوبصورت موڑ دیا۔ پورے ناول میں حیات انسانی کے تمام تر پہلوؤں سے جس طرح ایک کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کرنا چاہا اور فطرت انسانی اور بشری کمیوں

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)۔ ڈاکٹر اشفاق احمد خاں ص ۸۹

کے ساتھ ساتھ ایک فرمانبردار اولاد کا بلکہ کہنا چاہیے انسان کا جو نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے اس میں وہ پورے طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ کلیم کی زبانی ایک لمبی گفتگو جو انھوں نے پیش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کے اصل مقصد کو پا گئے ہیں۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں کلیم کہتا ہے:

''میں اپنے مرنے کو ترجیح دیتا ہوں اس نالائق زندگی پر جو میں نے بسر کی ہے اگرچہ میں اپنے زندگی خرابی اور رسوائی اور فضیحت اور والدین کی نارضامندی اور خدا کی نافرمانی میں کاٹی اور ایسی ایسی ہزاروں زندگیاں ہوں تو بھی اس نقصان کی تلافی کی امید نہیں جو اس چند روزہ زندگی میں مجھ کو اپنی بدکرداری سے پہنچا۔ مگر مجھ کو تین طرح کی تسلی ہے۔ اول یہ کہ میں مرتا ہوں تائب، نادم، پشیمان، متاسف، خجل۔ دوسرے یہ کہ سفر آخرت شروع کرتے وقت اپنے لوگوں میں ہو جو اس راہ کے منزل شناس اور میرے دل سوز اور ہمدرد، شفیق اور مہربان حال ہیں۔ تیسرے یہ کہ غالباً میری زندگی دوسروں کے لیے نمونہ عبرت ہوگی کہ اس صورت میں گو اپنی زندگی سے میں خود مستفید نہیں ہوا لیکن اگر دوسروں کو کچھ نفع پہنچے تو میں ایسی زندگی کو رائیگاں اور عبث نہیں کہہ سکتا ؎

من نہ کردم شما حذر بکنید

اب دنیا میں مجھ کو سوائے اس کے اور کوئی آرزو باقی نہیں کہ میں ابا جان سے اپنا قصور معاف کرا لوں۔'' [1]

اس میں شک نہیں کہ اگر کلیم بچ جاتا تو وہ نیکی اور دینداری میں اپنے سب بھائی بہنوں پر سبقت لے جاتا۔ اس نے مصیبت اٹھا کر اپنی رائے کو بدلا تھا اور آفتیں جھیل کر تنبیہ حاصل کیا۔

---

[1] توبۃ النصوح بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی نذیر احمد ص ۴۵۷

پس وہ مجتہد تھا اور دوسرے مقلد، وہ محقق تھا اور دوسرے ناقل۔ اس کا سا انجام خدا سب کو نصیب کرے۔ کلیم کا جوان مرنا ایک ایسی بھاری موت تھی کہ ماں باپ تو دونوں گویا کہ ساتھ در گور ہو گئے، بھائیوں کا بازو ٹوٹ گیا، بہنوں کے سر سے ایک بڑا سرپرست اٹھ گیا لیکن بتقاضائے دینداری سب نے صبر جمیل کیا اور ہر شخص نے بجائے خود عبرت پکڑی۔ کلیم کے ساتھ نصوح کی وہ تمام کوششیں بھی تمام ہوئیں جو اس کی اصلاح خاندان کے لیے کرنی پڑی تھیں کیونکہ کلیم مرحوم کے سوائے سب چھوٹے بڑے اس کی رائے میں آ چکے یا تو ابتداً علیم کے انٹر پاس کرنے کے لالے پڑے تھے یا اس نے بی۔اے پاس کیا۔ ایک سے عمدہ نوکری گھر بیٹھے اس کے لیے چلی آتی تھی مگر اس نے اپنی نیک نہادی کی وجہ سے سر رشتہ تعلیم کو یہ سمجھ کر پسند کیا کہ ہم وطنوں کو نفع پہنچانے کا قابو ملے۔ سلیم بڑا ہو کر طبیب ہوا تو کیسا کہ آج جو دلی کے بڑے نامی طبیب ہیں وہ اس کی بیاض نسخوں سے مطب کرتے ہیں۔ رہی ولیہ مادرزاد حمیدہ قرآن حفظ کیا، حدیث اس نے پڑھی اور اگر سچ پوچھیے تو شہر کی مستورات میں جو کہیں لکھنے پڑھنے کا چرچہ ہے یا عورتیں خدا رسول کے نام سے واقف ہیں یہ سب بی حمیدہ کی بدولت۔ [1]

---

[1] توبۃ النصوح بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی نذیر احمد ص ۴۵۸

(ب) ڈپٹی نذیر احمد کے دوسرے دور کے ناولوں میں اصلاحی رُجحانات

(i) محسنات یا فسانۂ مبتلا

(ii) ابن الوقت

(iii) ایامیٰ

(iv) رویائے صادقہ

محصنات یا فسانۂ مبتلا

فسانۂ مبتلا نذیر احمد کا چوتھا نصیحت آموز ناول ہے، اس کا سنہ اشاعت ۱۸۸۵ء ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے ایک اہم سماجی مسئلہ تعداد ازدواج کو اپنے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی ہے یعنی تعداد ازدواج کی برائیوں اور خامیوں کا اظہار بڑی بے باکی اور برجستگی سے کیا ہے۔

نذیر احمد پائے کے عالم تھے اور دینی مسائل میں خاصا درک رکھتے تھے اور بعض ایسے اہم اور نازک مسائل پر بھی قلم اٹھانے کے اہل تھے جن پر ان سے پیشتر کسی بھی عالم دین کی جرأت نہ ہوسکی۔ مثال کے طور پر تعدد ازدواج و نکاح کی اجازت قرآن نے دی ہے اور اس کے عمل کا ثبوت خود پیغمبر اسلام اور ان کے صحابۂ کرام کی زندگیوں سے ملتا ہے لیکن نذیر احمد نے یہ جرأت کی ہے کہ عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود اس کے خلاف مدلل بحث کے ذریعہ تعداد ازواج کی رسم کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں عذاب ثابت کریں۔ اس شرعی مسئلے پر مبتلاء اور عارف کی حجت و بحث نے مسئلے کے تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا ہے۔[1]

تمول کے اعتبار سے مبتلاء ایک خوش حال باپ کا بیٹا ہے اور چونکہ نو بیٹیوں پر ایک بیٹا تھا جب وہ پیدا ہوا تو گلی کوچے میں ہر طرف ایک ہنگامہ سا تھا۔ آس پڑوس کے سب لوگوں کو ایک

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر اشفاق احمد خاں ص ۵۹

حیرت سی ہوئی کی بڑھاپے میں نو بیٹیوں پر ایک لڑکا ہوا۔ چنانچہ اسے ہر طرح سے زمانے کی بری نظروں سے بچا کر پرورش کی گئی یہاں تک کہ لیل و نہار کے خاص خاص اوقات سے اپنے بیگانے کی نگاہ سے، آئے گئے کی پرچھائیں سے، لوگوں کی باتوں سے، تنہائی سے، تاریکی سے، چاندنی سے، کتے بلی سے، چھپکلی سے، دیو سے، بھوت سے، جن سے، پری سے غرض ہر چیز سے جو واقعی ہے اور ہر چیز سے جو ادعائی ہے۔ بہر کیف مبتلاء کسی نہ کسی طرح سے خدا کے فضل سے پلا بڑا ہوا۔[1]

نذیر احمد نے اس ناول میں بھی اپنی ذہانت اور مشاہدے کا کمال دکھایا ہے۔ میاں بیوی کی نوک جھونک کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں وہ زبان و بیان دونوں حیثیتوں سے ماہر نظر آتے ہیں جوان کے پختہ کار ہونے کا ثبوت ہے۔ اس ناول میں مخالف ماحول میں بھی زندگی گذارنے کا درس ملتا ہے اور سماج کی کسی حالت میں عدم توازن اور عدم اعتدال نہ ہو اور یہی بات اس ناول کی فلسفہ حیات کہی جاتی ہے جس کی طرف اس کے دیباچہ میں اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

ان الفاظ پر نذیر احمد زندگی کے اس مسلسل رزمیہ کو ختم کر دیتے ہیں کہ:

> "اگر بعض یا سب کے سب غلط ہوں تاہم میرا دل مطمئن ہے کیونکہ میں نے ان کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجھ کو جتنی سمجھ دی گئی ہے اس سے بڑھ کر مجھ سے باز خواست نہیں ہو سکتی لا یکلف اللہ نفسا الا ما اتیها (خدا نے جس کو جتنا دے رکھا ہے اس سے بڑھ کر کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا)۔ اب بھی مجھے کبھی کبھی اختلافات اور اعتراضات کا خیال آیا کرتا ہے

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۶۲۶

لیکن پہلے جو مجھ کو پہاڑ معلوم ہوا کرتا تھا، اب میں اس کو پھونک مار کر اڑا دیا
کرتا ہوں۔ میں نے اصول ہی ایسے ٹھہرا رکھے ہیں کہ وہ اعتراضات کو اپنے
پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔'' [1]

اس ناول کی تصنیف کا خیال نذیر احمد کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ توبتہ النصوح وغیرہ تصنیف کر رہے تھے جیسا کہ اس ناول کے دیباچہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ غالباً اس وقت نذیر احمد اعظم گڈھ میں قیام پذیر تھے۔ اسی زمانے میں بشیر الدین احمد کی شادی کی گفتگو اعظم گڈھ کے ہی کسی خاندان میں چل رہی تھی۔ مولوی بشیر الدین احمد سے دریافت کرنے پر وہ اس شادی کے لیے راضی ہو گئے تھے مگر نذیر احمد بعد میں تیار نہیں ہوئے اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناول کا ابتدائی ماحول یہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔

دس سال کے وقفے میں بشیر الدین احمد کی شادی ہو چکی تھی مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی لہٰذا نذیر احمد اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس کے لیے نہ تو بیوی صاحبہ راضی تھیں اور نہ بشیر الدین احمد ہی۔

تعداد ازدواج کی خامیوں یا کمیوں یا ان سب سے پیدا ہوئے حالات کے متعلق ڈپٹی نذیر احمد کو کسی دوسرے ناول یا افسانے سے معلومات نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ موضوع بالکل غیر متعلق تھا بلکہ عجب اتفاق کہیے کہ ڈپٹی نذیر احمد خود اس مسئلے سے دوچار تھے۔ ان کی والدہ ان کی دوسری شادی اپنی مرضی سے دیہات میں اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں کرانا چاہتی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اس دیہات کی شادی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کے دل میں دہلی کا ماحول

---

[1] رویائے صادقہ - ڈپٹی نذیر احمد ص ۲۱۶

بس گیا گیا اور دہلی کی عورتوں کی زبان ان کے دل میں گھر بنا چکی تھی۔ اسی لیے انھوں نے بجنور والوں کی لاعلمی میں اپنی مرضی سے اپنی شادی دہلی میں کر لی تھی۔ پھر بھی ان کی والدہ نے اپنی مرضی سے ایک اور شادی ان کی کروادی۔ نتیجے کے طور پر تعدداز دواج کا جو تجربہ ان کو ہوا تو وہ بالکل ہی اس کے خلاف تھے۔ دوسری طرف بشیر الدین احمد کے کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کی نوبت آ رہی تھی اور ڈپٹی نذیر احمد اس شادی کے موافقت میں تھے۔ اسی لئے انھوں نے اس ناول کی تصنیف کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن یہ موضوع بشیر الدین احمد کے لیے ایک نیا مسئلہ بن چکا تھا۔ اس وقت وہ تعدداز دواج کے خلاف تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس کی مخالفت میں والد صاحب اپنا ناول لکھیں۔ اس لیے اس کی تصنیف میں وہ شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا اعتراف ناول کے اس دیباچہ میں بھی کھلے لفظوں میں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ناول بھی فنکار کی ذہنی اور نجی زندگی کی شدید کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اس کا موضوع بالا بالا نہیں ہے بلکہ خود مصنف کی زندگی سے ماخوذ ہے۔

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ناول خالص سماجی اور معاشرتی ناول ہے جس مسلم سماج کی ایک بہت بڑی خرابی کو ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد شرعی حکم ہونے کے باوجود اپنے نقطۂ نظر کی پرزور تائید کی ہے۔ اس زمانے میں مذہب کے حکم کے خلاف تعدداز دواج سے متعلق اس حکم کے منافی آواز اٹھا کر نذیر احمد نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے فن کا راز جرأت کی یہ بھی ایک مثال ہے۔ نذیر احمد نے اپنے اس نقطۂ نظر کے لیے چند مذہبی جواز بھی پیش کیے۔ ان میں کافی اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کے دور میں وہ معاشرہ بھی نہیں تھا جس میں تعدادازواج کی اجازت دی گئی تھی۔ اس وقت (قرون وسطیٰ) کے مسلمانوں پر اس رسم ورواج کی اتنی غلط قسم کی پابندیاں نہیں تھیں۔ طلاق اور خلاء کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی آزادی تھی۔

اس معاشرتی ناول کے ذریعہ تعدد ازدواج کے اور بہت برے اثرات کو اجاگر کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد اس حیلہ شرعی کو ختم کرنا چاہتے تھے جس کی آڑ میں غریب اور مجبور عورتوں کو غلام بنالیا جاتا ہے۔ان کو پابند کر کے اور اپنے سے منسوب کر کے ان بے زبانوں کے حقوق بھی پورے پورے ادا نہیں کیے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں اپنی استطاعت کا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ اس تصنیف کے لیے سب سے زیادہ ان کے اپنے بڑے بیٹے (یا بیٹے) مولوی بشیر الدین احمد نے اکسایا تھا اور مولوی ڈپٹی نذیر احمد کے بقول اس ناول کی تصنیف میں شریک غالب رہے۔خود بشیر الدین احمد نے ''اقبال دلہن'' کے نام سے ایک ناول ۱۹۰۷ء میں تصنیف کیا اس وقت ان کی بھی دوسری شادی ہو چکی تھی۔''اقبال دلہن'' بھی بشیر الدین احمد کی آپ بیتی ہی کا درجہ رکھتی ہے۔فسانہ مبتلا کے برعکس اس میں تعدد ازدواج کے لیے جواز پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار اقبال مرزا کے یہاں بھی پہلی شادی سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔آخر اس کو اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنی پڑتی ہے۔اس کے لیے اسلام میں شادی سے ایک اہم منشا یہ بھی بتائی گئی ہے۔وہ اپنی بیویوں کے پاس اولاد کے لیے جانے کا حکم دیتا ہے، محض نفس کے تقاضے پر نہیں اور ''اقبال دلہن'' میں یہی مقصد پیش کیا گیا ہے۔[1]

تعدد ازدواج کے علاوہ اس ناول میں اور بھی دوسرے معاشرتی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔اس ناول میں مبتلا کی پرورش کے طریقوں اور مکتب کی پڑھائی، مدرسہ کے اساتذہ کی غیر ذمہ دارانہ رویوں اور مدرسہ کے تعلیمی ماحول پر افسوس کیا گیا ہے اور مبتلا کی پرورش پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔مدرسہ میں عشقیہ مضامین اور غیر اخلاقی جذبات کو ابھارے جاتے تھے اور رائج

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے)-اشفاق اعظمی ص۲۳۹

بھی تھے۔ ان جگہوں پر اخلاق کی درستگی پر کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا نیز اس ناول میں عورتوں کے متعلق وراثت کے مسئلہ کو اجاگر کیا گیا ہے، حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے۔ مبتلا کی پرورش کے سلسلے میں خاندان والوں کی طرف سے اسے بے جا لاڈ پیار اور پرورش کے غلط طریقوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس موضوع پر بعد کے ناول نگاروں نے مکمل ناول تصنیف کی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں احسان عباس صاحب نے اس موضوع پر ''زاہدہ'' نام سے ایک مختصر قصہ تصنیف کیا ہے۔ عباسی صاحب مدرستہ العلوم کے سال اول کے گیارہ طلبا میں سے ایک ہیں جن سے سرسیدؒ نے کالج کا آغاز کیا تھا۔

نذیر احمد بچوں کی پیدائش کے سلسلے میں خاندان میں جو خوشیاں منائی جاتی ہیں اور خاص طور پر جب ایک عرصہ کے انتظار کے بعد کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے تو کس طرح خاندان والے اس کی خوشیاں مناتے ہیں اور پروش میں کس قدر بے جا لاڈ پیار کا دخل رکھتے ہیں کہ آگے چل کر اولاد کے کردار اور اخلاق پر اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کچھ مبتلا کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ ایک ایسے گھریلو ماحول میں مبتلا ۱۴ رسال رہا کہ اس کے اندر خود فریفتگی اور نسوانیت کا مادہ پیدا ہو گیا۔ جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا تو کئی لڑکوں کا منظور نظر ہو گیا اور یہیں سے اس کے اندر آوارگی پیدا ہوئی۔[1]

مبتلا کے باپ کا اثر گھر میں بالکل نہیں تھا۔ وہ مبتلا کی اصلاح نہ کر سکا لہٰذا اس نے اپنے لڑکے کو جلد سے جلد شادی کے بندھن میں دینا چاہا لیکن گھریلو مصروفیت کی وجہ سے اس میں تاخیر ہو گئی۔ دوسری طرف مبتلا کے گھر والوں کے بے حد غرور کی وجہ سے شہر کے رشتہ داروں کا

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے)-ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۴۲

آنا جانا بند ہو گیا۔ دریں اثنا مبتلا کی شہر کی آخری سگائی ٹوٹ گئی۔ چنانچہ شہر بھر میں چرچہ رہا اور لوگوں نے اس کی وجہ خود مبتلا کو ہی بتایا اور شہر بھر میں ہجڑا اور زنخا مشہور کر دیا۔

آخر کار مبتلا کی شادی ان کے والد نے اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں کر دی۔ اس کی بیوی خوبصورت نہیں تھی اور مبتلا کے اپنے چاہنے والوں کا ایک ہجوم سا اس کے گرد تھا۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنی بیوی کی طرف سے غافل رہا۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی۔ ان اس کا دھیان گھر کی طرف ہوا۔ اس وقت تک میاں بیوی کے تعلقات کافی خراب ہو چکے تھے۔ ایک تو مبتلا کی بیوی غیرت بیگم دیہات کی رہنے والی تھی اور شوہر کی مسلسل بے توجہی کی وجہ سے بددل ہو گئی۔ اس طرح امور خانہ داری کی طرف اس کی توجہ صفر ہو گئی اور گھر میں خاک اُڑنے لگی۔ اب جب کہ مبتلا گھر کی طرف متوجہ ہوا تو اس کو گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ گندگی، بدسلیقگی کا ہر طرف دور دورہ ہو گیا۔ جو چیز جہاں پڑی ہے وہیں پڑی ہے نتیجہ کے طور پر مبتلا کی طبیعت گھر سے اجاڑ ہو گئی۔ اسی دوران اس کی ملاقات ہریالی بیگم سے ہو گئی اور وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ بعد میں اس سے نکاح کر لیا اور پھر گھر میں وہ ایک ماما کے بھیس میں رہنے لگی۔ ہریالی بیگم تو بازاری تھی لیکن تھی لکھنؤ کی رہنے والی صفائی پسند، سلیقہ پسند۔ اس نے چند روز میں گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس کے انتظام سے غیرت بیگم اپنی جگہ خوش تھیں اور ہریالی مبتلا اپنی جگہ خوش تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کس شاندار طریقے سے سماج کو اور زمانے کے لوگوں کو یہ نصیحت دی ہے کہ اگرچہ مبتلا نے دوسری شادی کر لی تھی اور اس کو لے کر گھر ہی کے اندر ایک دوسرے حصے میں رہنے لگا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ زیادہ تر وہ ہریالی بیگم کے ساتھ ہی رہنے لگا اور غیرت بیگم نے بھی اپنی سوکن ہریالی بیگم کو ستانے میں طرح طرح سے زچ پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی یہاں تک کہ ان

کے اس غیر اخلاقی کام میں ان کے بھائی حاضر اور ناظر بھی برابر کے شریک رہے تبھی تو جب غیرت بیگم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ہریالی پیٹ سے ہے تو انھوں نے ماما کے ذریعہ سے ہریالی کو زہر دے دیا اگر چہ ہریالی بچ گئی اور اس سلسلے میں ان کے بھائیوں نے غیرت بیگم کو قانونی شکنجے سے بچالیا اور مبتلا کی بھی اچھی خاصی مرمت کی۔ آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کی مبتلا قرضدار ہو گیا تا حد یکہ ہریالی کی طرف سے بھی اس کی طبیعت افسردہ ہو گئی اور وہ اکیلے مردانے میں پڑا رہتا تھا اور پھر اس کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا اور ایک دن اکیلے پڑے پڑے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ مرتے وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا حتیٰ کہ دن چڑھے تو کروں نے اس کے مرنے کی خبر دی۔

ہریالی بیگم تو رفو چکر ہو گئی لیکن غیرت بیگم نے اس سانحہ کا بے حد سوگ منایا اور ان کو اپنی بے مہری کا شدید احساس ہوا اور اس قدر شدید ہوا کہ چھ مہینے کے اندر اندر مر کے مبتلا کے پائینتی دفن ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی وصیت تھی کہ بتول کے ابا کے پائینتی ہی دفن کیا جائے۔ زندگی میں تو وہ اپنے قصور کو اپنے شوہر سے معاف نہیں کرا سکی، ان سے معافی نہیں مانگ سکی تو مرنے کے بعد ان کے پیر کی طرف اس کا سرا رہے شاید کچھ گناہ کم ہو جائے۔

اس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے دوسری شادی کے بعد گھریلو ماحول کس طرح خراب ہو جاتا ہے۔ مبتلا کی حالت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اتنے ناز ونعم سے پلا بڑھا مبتلا اپنے غلط رویوں اور اپنی غلط عادتوں سے کس طرح زندگی میں پریشان حال ہوا یہاں تک کہ دوسری شادی جو اس نے ایک طوائف سے کی تھی اس کے مرنے کے بعد رفو چکر ہو گئی۔ دوسری طرف تمام قصوں کے بعد غیرت بیگم پھر اپنی فرض شناسی شوہر پرستی کی طرف مبذول ہوئیں اور کس طرح ان کو اپنے قصور یاد آنے لگے، کس قدر ان کو اپنے گنہگار ہونے کا احساس

ہونے لگا کہ جب خود ان کو اپنے انتقال کا وقت قریب آتا ہوا محسوس ہوا تو انھوں نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو بتول کے ابا کے پائینتی دفن کیا جائے۔ اس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے فطرت نسواں کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے عورتوں کی نفسیات کے متعلق خیالات و تجربات کا اظہار کچھ اس طرح فرمایا ہے کہ:

> ''عورت کے لیے محض خاندان ہی گھریلو زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ سلیقہ مندی، صفائی، شوہر کی مزاج شناسی اور آپسی نباہ کے دیگر طریقوں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔'' [2]

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اس ناول میں اصلاحی رجحان دیا ہے کہ اولاد کی پرورش میں اولاد کے ساتھ بیجا ناز برداری کی جاتی ہے جس کی وجہ سے جرأمندی اور مردانہ صفات کی کمی ہو جاتی ہے۔ زندگی کی مصیبتوں کا وہ سامنا نہیں کر پاتے اور خود اعتمادی کی کمی بھی ہوتی ہے۔ مکاری، بزدلی اور نسوانی اوصاف بھی رونما ہونے لگتے ہیں جو کہ ایک خاص قسم کے گھریلو ماحول اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ [3]

نذیر احمد کہتے ہیں کہ اگر بچپن سے ہی بچہ کو دینی تعلیم دی جائے اور اس کے دل و دماغ میں بچہ کی عمر کے حساب سے دینی تعلیم سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے تو اس کو آسانی سے سیکھ لیتا ہے اور پھر پوری زندگی بچہ کی دینی تعلیم کے مطابق گذرتی ہے۔ چنانچہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے)۔ ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۴۳

[2] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے)۔ ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۴۷

[3] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے)۔ ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۵۰

”دین کی تعلیم کے لیے ایک وقت مناسب ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہو مگر سن طفولیت کیوں کہ آدمی کی عمر جس قدر بڑی ہوتی جاتی ہے اسی قدر فطرت سے دور اور اسی قدر اس کا دل لوث دنیا سے آلودہ اور زنگ اغراض سے تیرہ ہوتا جاتا ہے پھر شاید ایک وقت ایسا آئے کہ اس کے دل میں صبغت اللہ یعنی دین کا رنگ اٹھانے کی قابلیت باقی نہ رہے۔“ [1]

ڈپٹی نذیر احمد نے مبتلا کی اقتصادی حالت کا نقشہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ مختلف سرکاروں کی طرف سے اس کو خرچ کے لیے روپئے اس کو والد کی زندگی سے ملتے چلے آرہے تھے یہ الگ بات ہے کہ والد محترم کے انتقال کے بعد وہ اپنی بدمستی میں اور آوارگی کی وجہ سے اپنی وراثت نہیں بچا سکا اور نہ ہی ان روپیوں کو جاری ہی رکھ سکا جو اس کے والد صاحب کو ملتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد مالی اعتبار سے بہت ہی پریشان رہنے لگا بلکہ یوں کہا جائے کہ قرض دار ہو گیا اور قرضداری کا کچھ ایسا بوجھ اس کے دل و دماغ پر پڑا کہ اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا نتیجہ کے طور پر وہ گھر سے باہر نکلنا ہی تقریباً بند کر دیا۔ اس گھر کے اندر مردانہ خانہ کی ایک کوٹھری میں پڑا رہتا تھا بالکل تنہا اور اس طرح پڑے پڑے ایک دن دنیا سے چل بسا۔

جیسا کہ احسن فاروقی لکھتے ہیں:

”مگر مولانا اس معاملہ کی نفسیاتی تہہ تک نہیں پہنچ سکے کہ اصل میں شادی کا معاملہ بہت کچھ اقتصادی سوال ہے۔“ [2]

لیکن احسن فاروقی صاحب یہ کیسے بھول گئے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی میں اقتصادیات کا

---

[1] فسانہ مبتلاء بحوالہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۶۸۶

[2] فسانہ مبتلاء مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۰۰

بہت زیادہ دخل نہ تھا جب کہ وہ اقتصادی پہلو کی بہتری کے لیے سود تک کو جائز ٹھہرائے ہوئے تھے تو بھلا شادی کے مسئلے کو اقتصادیات سے ہٹ کر کیسے سوچ سکتے تھے اور یہی اقتصادی پہلو مبتلا کی موت کا سبب بنا۔ اس لیے کہ اس مسئلے کے حل کی کوئی صورت مبتلا کے پاس نہیں تھی۔ ناول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تعدادِ ازدواج کے مسئلے کو اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔

اس ناول میں دوسری شادی کے جو احوال بیان کیے گئے ہیں اور جس انداز سے بلکہ یوں کہا جائے کہ اس سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی ایسا مرد ہوگا جو دوسری شادی کا خواہاں رہے۔ اتنی خوبصورتی سے ڈپٹی نذیر احمد نے دونوں سوکن کے حالات لکھے ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح سید حاضر نے ٹھہرا دیا تھا۔ مبتلا ایک ایک دن باری باری سے دونوں گھروں میں رہتا تھا۔ بڑے میں تو کوئی اس سے بولتا چالتا نہیں تھا۔ کسی دن اگر معصوم کو پکڑ پایا تو گھڑی دو گھڑی اسے جی بہلا یا ورنہ منھ لپیٹا سو رہا۔ خاطر داری سمجھو، مدارات سمجھو، آؤ بھگت سمجھو، جو کچھ تھی سو چھوٹے گھر میں تھی مگر غیرت بیگم اس کو وہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیتی تھی۔ اس پر بھی اس کا جی نہیں مانتا تھا۔ ایک موکھا تو اس نے پاخانہ کی دیوار میں کیا کہ چھوٹے گھر کے سہ درّے کی ذرا ذرا بات وہاں سے سنائی دیتی تھی۔ رہ گیا ایک ضلع صحن سایہ بان اور سایہ بان کے اندر کا دالان سو غیرت بیگم کی طرف ایک بالا خانہ تھا اور اس میں تھی ایک کھڑکی کی، کھول دو تو صحن سے لے کر اندر والے دالان تک سب کچھ دیکھائی دیتا تھا۔ یا تو غیرت بیگم نے جس دن کی بیاہی آئی کبھی بالا خانہ پر پاؤں پہن رکھا تھا یا اب سوکن کی ضد پر جس دن چھوٹے گھر کی باری ہوتی صبح سویرے سے کوٹھے پر چڑھی چڑھی اگلی صبح کو اترتی۔ غرض ساری گرمی غیرت بیگم نے میاں کو ہریالی سے بات نہیں کرنے دی۔ جاڑا آیا اور پردے چھوڑ کر

دالان میں سونے لگے تب تھک کر بیٹھی۔ شروع میں تو نوکروں کو آنے جانے کی ایسی سخت ممانعت تھی کہ ایک مرتبہ ایک لونڈی نے باہر کی دیوڑھی میں سے آگ پکڑا دی تھی، غیرت بیگم کو خبر ہوگئی تو اس کے ہاتھ پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا۔ [1]

دوسری شادی کے بعد مبتلا کی ازدواجی زندگی میں جو غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں ان میں خاص طور پر میاں بیوی کے آپسی تعلقات بیحد خراب ہو گئے۔ دن کا دن مبتلا مردانہ میں ایک کوٹھری میں پڑا رہتا تھا اور غیرت بیگم کبھی غلطی سے بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کے چچا میر متقی' مبتلا کے کاروبار کو درست کرتے ہیں، میاں بیوی کے تعلقات کو بحال کرتے ہیں، حاضر و ناظر' جو کہ غیرت بیگم کے بھائی ہیں ان کو غیرت بیگم حصہ دینے پر آمادہ کرتی ہیں۔

غرض تعدد ازدواج ہمارے مذہب میں جائز ہے لیکن ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ذاتی تجربے اور اپنے لڑکے مولوی بشیر الدین احمد کی دوسری شادی کے تجربوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تعدد ازدواج کسی بھی صورت میں پرسکون زندگی کا باعث نہیں بن سکتا۔ جس طرح سوکنوں کے حالات کا تجرباتی تجزیہ کر کے ڈپٹی نذیر احمد نے ہمارے سامنے حالات رکھے ہیں اور خود مبتلا کی زندگی جن حالات سے دوچار ہوئی ہے قاری خود اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ تعدد ازدواج کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے؟ تعداد ازدواج کی محرک شے کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد نے بچہ کی پرورش کو بھی ذمہ دار بتایا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو دین سے دور رکھ کر پرورش کرتے ہیں۔ بے ناز برداری بچے کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کو جفاکشی، محنت اور اعمال صالحہ کی تلقین اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہی نہیں دلواتے تا حدیکہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور وہ تعیش بھری زندگی گذارتے گذارتے اس لائق

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۴۴۷

بھی نہیں ہو پاتا کہ سمجھ سکے کہ دنیا ایک امتحان کہ جگہ ہے، ایک زبردست محنت اور جفاکشی کی جگہ قدم پر قدم چیلنجز ہیں۔ مبتلا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ چھ بہنوں کے بعد مبتلا اولادِ نرینہ کے طور پر اپنے گھر میں جنم لیتا تھا نتیجے کے طور پر بے جا ناز برداری کی گئی۔ دنیا کے سخت تجربوں سے ناآشنا اپنے عیش وعشرت کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسری شادی کرلی ہر چند کہ اس کے دوستوں نے اس کو منع کیا مگر اس نے دوسری شادی کر ہی لی اور اسی دوسری شادی نے بالآخر اس کی زندگی میں طرح طرح کے مصیبتوں کو جنم دینا شروع کیا اور پھر صحت خراب رہنے لگی۔ قرض دار ہو کر تھک ہار کر گھر کے اندر مقید ہو گیا اور رفتہ رفتہ بظاہر اس کی موت کا سبب بن گئی۔

اس ناول کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فسانہ مبتلا نذیر احمد کا کامیاب ترین قصہ ہے۔ اس کے تین لاجواب کردار غیرت بیگم، مبتلا اور ہریالی' مصنف کی کردار نگاری کے کامیاب نمونے کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ناول یہ بھی مقصدی ہے مگر فن کے اسرار و رموز سے جو واقفیت اس قصے میں نظر آتی ہے ان کے دوسرے ناولوں میں موجود نہیں۔ اس میں پلاٹ تعمیر مناسب، مربوط اور معقول ہے۔ اس میں گفتگوؤں کا طول کم اور مکالموں کی ہیئت فطری ہے اور مقصد فن کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اعتراض کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔'' [1]

وقار عظیم اس ناول کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''فسانہ مبتلا اُردو کا پہلا ناول ہے جس نے صحیح معنوں میں زندگی کی

---

[1] فسانہ مبتلا، مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۰۰

انفرادیت اور باہمی رشتہ کی داغ بیل ڈالی اور نذیر احمد کے بعد آنے والے
ناول نگاروں کو فن کی روایت کا ایسا معیار ملا جس میں بہت سی خامیوں کے
باوجود مکمل فن کی ساری نشانیاں موجود ہیں۔'' [1]

اس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے تعداد ازدواج کے متعلق اپنے جامع انداز میں اپنا موقف پیش کیا کہ ہمارے ماحول میں تعداد ازدواج ہمارے لیے کس قدر پریشانی کا باعث ہے کہ قاری کو ناول پڑھتے پڑھتے تعداد ازدواج سے نفرت ہونے لگتی ہے اور یہی مصنف کا مقصد بھی ہے۔

ابن الوقت

اس دور کا سب سے اہم ناول ابن الوقت مانا جاتا ہے چونکہ ابن الوقت نذیر احمد کے پہلے دور کے ناولوں کی ہی ایک کڑی ہے۔ یہ ناول ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

ابن الوقت ڈاکٹر نذیر احمد کا معرکتہ الآرا ناول ہے۔ اس ناول سے قبل تمام ناولوں میں مذہب کی لے زیادہ حاوی رہی ہے۔ ابن الوقت نذیر احمد کا پہلا معاشرتی ناول ہے۔ عام طور پر مشہور ہوا کہ اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے سرسیدؒ کے کردار کا چربہ اتارا ہے۔ سید افتخار احمد مرحوم نے حیات النذیر (صفحہ ۲۳۶) میں لکھا ہے کہ سرسیدؒ کے صاحبزادے سید محمود کو نذیر احمد سے یہ شکوہ تھا کہ انھوں نے ابن الوقت سرسیدؒ پر لکھی ہے جس کا جواب نذیر احمد نے خلاف امید یہ دیا تھا کہ:

''انگریزی وضع کے مقلدوں کی ملاحی گالیاں دی ہیں، جو چاہے
گالیاں اپنے اوپر لے۔'' [2]

---

[1] داستان سے افسانہ تک ص ۶۰

[2] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۶۰

واقعہ جو بھی ہو مگر نذیر احمد کے پیش نظر ایک ایسی سوسائٹی تھی جس کی قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ نئے اور پرانے سماج میں افراتفری مچ چکی تھی۔ نذیر احمد کو یہ تبدیلیاں منظور تو تھیں مگر وہ مشرقی تہذیب کے کچھ مخصوص پہلوؤں کو جوں کا توں قائم رکھنے کے بھی خواہاں تھے۔ وہ ابن الوقت کی موقع پرستی سے اس قدر نالاں تھے کہ وہ سمجھتا تھا کہ انگریزی وضع قطع اختیار کرنے لینے سے انگریزوں کی خوشنودی حاصل ہو جائے گی اور انگریزوں کی نظر میں وہ زیادہ باوقار اور محترم بن جائے گا۔ مگر نوبل صاحب کے ولایت چلے جانے سے ابن الوقت کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس کی غلط فہمی تھی اور بعض افسر جو اس کی اس حرکت سے نالاں تھے نوبل صاحب کے ولایت چلے جانے کے بعد اس سے ناراض رہنے لگے۔ ابن الوقت ایک خوشحال آدمی تھا کیونکہ خدمات انگلشیہ کے سلسلے میں اسے ملازمت اور جاگیر عطا کی گئی تھے مگر اس کی یہ تمنا کہ سفید فام قوم کس طرح اسے اپنی سوسائٹی کا ہی ایک محترم فرد سمجھنے لگے سراسر خام خیالی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے اس ناول کے ذریعہ یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ کسی غیر قوم کی وضع اختیار کر لینے سے اور اپنی وضع اور تمدن چھوڑ دینے سے کوئی محترم اور باوقار نہیں بن جاتا۔ انسان کا وقار اچھی قدروں اور اپنی قوم کے تئیں نیک جذبوں کے وجہ سے بڑھتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کا وقار اس بات سے بھی بڑھے گا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر قوم کی خدمت کو اپنا شعار بنالے اور یہ کہ آدمی اپنی وضع کو بلند کرے اور اپنے کردار کو بلند کر کے بلند مرتبت اور محترم بن جائے گا چہ جائے کہ کسی قوم کی وضع اختیار کی جائے۔ آدمی جب اپنے تمدن کے ساتھ اپنے وقار کو بڑھاتا ہے تو معاشی طور پر بھی وہ کبھی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی مقروض ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی اپنی تہذیب، اس کی اپنی وضع اس کی اپنی قوم کے مطابق ہوتی ہے جو کہ اس کو معاشی

اعتبار سے سمیٹے رہتی ہے جس کا کہ وہ موروثی اعتبار سے متحمل ہوتا ہے اور دوسروں کی وضع اختیار کرنے کے معاملہ میں اس کو معاشی اعتبار سے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ اس اضافی خرچ کا متحمل نہیں ہوتا اور کوئی بھی قوم کسی دوسرے قوم کے فرد کو اپنی قوم کے برابر اور اسے بلند دیکھنا گوارہ نہیں کرے گی، یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی بات کو ڈپٹی نذیر احمد اپنے اس ناول ''ابن الوقت'' میں دیکھانا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ انسان کسی بھی دوسری قوم کی اعلیٰ قدروں کو اپنا لے۔ اعلیٰ تعلیم سیکھ کر بہتر صفات اور اخلاق حسنہ کو اپنی زندگی میں داخل کر لیے یہاں تک تو ٹھیک ہے مگر ان سب کے لیے وہ اپنی پرانی تہذیب کو اپنی وضع کو چھوڑنے کے لیے یکسر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی بات کو ڈپٹی نذیر احمد تمثیلی انداز میں ابن الوقت کے کردار کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''اپنے تہذیب وتمدن میں مصلحتاً بے نیازی نے ابن الوقت کو نقصان پہنچایا یعنی اوّل تو وہ انگریزی وضع قطع اور طرز معاشرت کے باعث اپنی قوم سے بیگانہ ہوتا گیا اور دوسرے انگریزی معاشرت کے اختیار کر لینے سے اس کے اخراجات زندگی میں اضافہ ہو گیا کہ اس کی جاگیر کی آمدنی بھی ناکافی معلوم ہونے لگی یہاں تک کہ وہ دوسروں کا قرض دار رہنے لگا۔ جائداد کے فروخت کرنے کی نوبت بھی آ گئی، تیسرے یہ کہ رفتہ رفتہ اس کے دینی عقائد میں بھی خلل پڑنے لگا۔''[1]

مولوی نذیر احمد کے پیش نظر ابن الوقت کی تصنیف کے دو مقصد ظاہر ہوتے ہیں۔ اوّل یہ ہے کہ غدر کے بعد سے مسلمانوں پر جو تباہی آئی اور انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۶۰

سے جو نفرت پیدا ہو گئی اس کو فرو کرنا اور قومی آزادی کی سیاسی تحریک جو غدر کے بعد شروع ہو گئی تھی اس سے مسلمانوں کو دور رکھنا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید سے مسلمانوں کو دور رکھنا تا کہ اس نقائص سے باز رکھا جا سکے۔ ابن الوقت کا کردار اس ناول کا جاندار کردار ہے۔

اس ناول کا خاص موضع قومی تہذیب و معاشرت ہے۔ اس میں واقعات غدر ۱۸۵۷ء کے قریب کے لیے گئے ہیں کیونکہ غدر کے اثرات کا تفصیلی بیان اس میں ملتا ہے۔ چونکہ سرسیدؒ کا ذہن کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ اس کے شکار ہوتے جا رہے تھے۔ ایم۔ او کالج سے طلبا کی کئی کھیپ نکل چکی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں ایک درمیانی گروپ بھی پیدا ہو چکا تھا جس نے حالات سے ایک طرح سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تر پریشانی یہ تھی کہ وہ تہذیب و تمدن کو دین سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے میں اگر مغربی تمدن پورے طور پر اپنا لیا جائے تو دین میں بد عقیدگی پیدا ہونے کا ڈر تھا حالاں کہ وہ مغربی تہذیب اور اس کے کچھ مفید حصوں کے تقلید کے قائل تھے لیکن شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے دینی عقیدہ کے ساتھ وہ مغربیت کے حامی تھے۔ اس لیے کہ مغربی تہذیب و تمدن کو دین سے الگ سمجھنے لگے تو عقیدہ میں خرابی کے پورے امکانات ہیں۔ سرسیدؒ کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ سامنے آیا' ان کے دینی عقیدے میں فرق پڑنے لگا۔ چنانچہ اپنے زمانے میں سرسیدؒ بہت ہی متنازع شخصیت رہے ہیں اور شاید یہ اس لیے ہوا کہ مغربیت کی تقلید میں حدود شریعہ کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد ایک محدود دائرے میں مغربی تہذیب کے قائل تھے۔

اور یہ مسئلہ جو کہ تقلید سے متعلق ہے پورے زمانہ کا مسئلہ سمجھ گیا کیونکہ انگریزی معاشرت کے اختیار کرنے میں قوم اور ملک کے لوگوں کی اقتصادی حالت تباہ ہونے لگی تھی۔ اس کو بنانے

کے لیے کافی رقم درکار تھی۔ محمد طفیل منگلوری نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:

''ترک موالات بھی دراصل مغربی طرز معاشرت کے خلاف ایک احتجاج ہے، سودیشی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے اس ناول میں بہت ہی اہم مسئلہ کو ہاتھ لگایا گیا ہے۔'' [1]

ابن الوقت مغربی اور مشرقی تہذیب کے مابین کشمکش کی کہانی ہے۔ سیاست اور مذہب سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ مذہبی اعتبار سے دونوں گروہ کسی پیر طریقت کے محتاج ہیں اور سیاسی نظریات کے اعتبار سے یہ دونوں کردار کسی مخصوص گروہ یا جماعت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ خوشامد اور خوشہ چینی کے ذریعہ اگر وقتی طور پر کچھ منافع حاصل ہو جائے مگر اپنی ثقافت کو چھوڑ کر دوسروں کی وضع اختیار کرنے کے سلسلے میں کچھ دنیاوی منفعت بھی ہو تو نہیں قبول کرنا چاہیے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک انسان اپنی پہچان، اپنا تمدن کھو کر بھی کسی دوسری قوم کا فرد نہیں بن سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی کچھ اس ناول کے کردار ابن الوقت کے ساتھ بھی ہوا ہے کہ کس طرح اس نے نوبل صاحب کی جان بچائی اور ایک نامکمل مکان میں انھیں چھپائے رکھا جہاں ہر وقت پکڑے جانے کا خدشہ تھا اور دوسری طرف اس حال میں اور بھی پریشانی تھی کہ باغیوں کا ہجوم فتح پوری مسجد کے پاس جمع تھا اور اسی طرح انگریزی وضع اختیار کی گئی کہ کسی طرح انگریزوں کی نظر میں آجائیں اور ان کی قوم کا ایک فرد بن کر محترم ہو جائیں۔ اگرچہ اس وفاداری اور خدمت کے سلسلے میں (صلے) میں جاگیر تو عطا کی گئی مگر ان کی قوم کا فرد بن کر محترم بن جانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا اور یہ ایک

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۰۲

خام خیال تھا۔ دو قدروں کے تصادم اور خاص طور پر اپنی تہذیب اور سماجی قدروں کو چھوڑ کر لوگ مغربی تہذیب اپنا رہے تھے جس کی وجہ سے نذیر احمد کو بہت پریشانی تھی۔ مختلف طریقوں سے انھوں نے قوم کو انگریزوں کی تقلید سے روکنا چاہا مگر روک نہیں سکے۔ نذیر احمد کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے یہاں تسلط جما لینے سے یہاں کے لوگوں کا کاروبار متاثر ہو رہا تھا۔ لوگ بری طریقے سے ان کی تقلید کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک نئی تہذیب کو اپنانے میں روپے خرچ ہوتے تھے چنانچہ خود سرسیدؒ کے ساتھ یہی ہوا۔ انگریزی وضع کو نبھاتے نبھاتے ان کے اخراجات اتنے بڑھ گئے تھے کہ زمین تک کے بیچنے کی نوبت آن پڑی۔ لوگوں کے سرعت کے ساتھ انگریزی وضع اختیار کرنے اور ان کی زبان سیکھنے کے چکر میں خود ان کی اپنی زبان کے ساتھ سوتیلا سلوک ہونے لگا تھا جس سے ڈپٹی نذیر احمد بہت دل برداشتہ تھے۔ انگریزی تہذیب کس حد تک اثر انداز ہو چکی تھی اس کی طرف نذیر احمد نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ''یہ مصیبت! کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عمل داری نے ہماری دولت، ثروت، رسم و رواج، وضع اور طور طریقہ، تجارت، مذہب، علم و ہنر، عزت شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا ایک زبان تھی اس اس کا بھی یہ حال ہے۔'' [1]

ناول کے پہلے باب میں ابن الوقت کے ابتدائی نقوش ابھارے گئے ہیں اس کا ایک مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے کہ کس طرح اس نے تعلیم پائی۔ وہ ایک اچھے طالب علموں میں سے تھا۔ عربی فارسی میں ماہر تھا البتہ ریاضی میں قدرے کچا تھا۔ اس نے انگریزی باقاعدہ مضمون (subject) کے طور پر نہیں پڑھی ہے بلکہ ریاضی کے سلسلے میں وہ انگریزی سیکھتا گیا اور پھر اس

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۰۵

نے انگریزی میں مشق پہنچائی۔اس طرح وہ ایک اچھا خاصا انگریزی داں ہو گیا۔

ابن الوقت شروع سے ترقی پسند ذہنیت کا حامل تھا۔سوئے اتفاق اس کا تعارف انگریزی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار نوبل صاحب سے ہو گیا اور نوبل صاحب ایک آزاد خیال کے انگریز تھے وہ ہندوستانیوں کو قدامت پسندی سے نکال کر مغربی تعلیم اور زمانے کی جدت پسندی سے آشنا کرانا چاہتے تھے۔ابن الوقت کے دماغ میں تو اس تہذیب کی برتری کا احساس تو پہلے سے ہی تھا۔اب جب کہ نوبل صاحب سے تعلقات ہو گئے تو خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔دونوں میں مراسم بڑھتے گئے اور ابن الوقت کی آنکھیں انگریزی تہذیب سے اور بھی خیرہ ہو گئیں اور اس کی چمک دمک میں وہ اپنی پچھلی زندگی فراموش کرتا گیا۔آخر ایک دن نوبل صاحب کی ایما پر قوم کی اصلاح کا محکم ارادہ بھی کر لیا اور یکسر اس کے انجام کو وقتی بھلا دیا حالاں کہ کبھی کبھی اس کے انجام کو سوچ کر وہ ڈرتا بھی تھا۔ابن الوقت کی یہ حالت دیکھ کر قوم کے لوگ اس سے ناراض رہنے لگے اور اپنے قریبی رشتہ دار بھی برہم ہو گئے۔دوسری طرف نوبل صاحب کی جان بچانے کے صلے میں ابن الوقت کو زمینداری دی گئی جو کہ ایک باغی ہندو زمیندار سے چھین کر دی گئی تھی۔اس دوران ابن الوقت کا تعلق انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی سے اچھی طرح قائم ہو گیا اور نوبل صاحب کی وجہ سے ابن الوقت کی کافی عزت افزائی ہوتی تھی۔نوبل صاحب سے اختلاط، باہم گفتگو اور اکل شرب کا شرف بھی حاصل تھا جس کو دوسرے ہندوستانی حسرت اور رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔چنانچہ زبردست تعلقات کے باوجود ابن الوقت اپنی قوم کی اصلاح کی طرف سے غافل نہیں رہا۔اس کا خیال تھا کہ انتہائی قربت کے ساتھ انگریزوں کے ساتھ رہ کر ان کی اپنی ترقی کا راز جان کر کے وہ اپنی قوم کی برتری کا سبب بنے گا۔اس کی قوم کے افراد اس کے توسط سے اس تہذیب کی اہمیت اور فوقیت کا احساس کریں اور اپنی قدامت پسندی سے باہر نکلیں۔وہ اپنی زندگی

کی سطح کو بلند کریں تا کہ ان دوقوموں سے ارتباط ممکن ہو سکے۔ بغیر اس کے اس کی قوم ذلیل وخوار رہے گی۔ باہمی تعلقات سے اس کو بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کرنے کے مواقع فراہم ہوسکیں گے۔ [1]

لیکن نذیر احمد زندگی کے چڑھاؤ اتار کے بارے میں تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اپنی ہمہ جہت ترقی کے سلسلے میں ابن الوقت کی نظر نفسیاتی طور پر اس طرف مبذول نہیں ہوئی کہ ''ہر کمال را زوال است، ہر بلندی را پستی است'' تا کہ پوری ہوشیار کے ساتھ آدمی ترقی کے منازل کو طے کرے تا کہ کوئی منفی پہلو آ جائے تو آدمی وقت کے ساتھ اس کا تدارک کر سکے جیسا کہ ابن الوقت انگریزوں کے اس دوسرے گروپ سے واقفیت نہیں رکھتا تھا جو قدرے قدامت پرست خیال کا تھا جو انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اس قسم کے ربط وضبط کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ہندوستانیوں کو اپنے قدیم وضع میں ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ نوبل صاحب کے ولایت چلے جانے کے بعد یک بیک یہ گروپ ابن الوقت کے سامنے آ جاتا ہے۔ مسٹر شارپ نوبل صاحب کی جگہ مقرر ہوئے اور پہلی ہی ملاقات سے ابن الوقت سے اس کی وضع کی وجہ سے ناراض رہنے لگے اور ابن الوقت اس ناراضگی کی وجہ نہیں جانتا تھا۔ دوسرے یہ کہ عملے کے لوگ بھی جو ابن الوقت سے نوبل صاحب کے زمانے سے جلتے تھے مسٹر شارپ کو بھڑکاتے رہے۔ چنانچہ مسٹر میتھو شارپ نے ابن الوقت سے غدر کی تحقیقات کا کام لے لیا جس کی وجہ سے ابن الوقت کی عزت اور شہرت تھی اور مختلف طریقوں سے ابن الوقت کو پریشان کرنا شروع کر دیا اور اس کے پہلے وبائی امراض پھیلنے کے خطرہ کے سبب بنگلہ خالی کرنا پڑا جس کی وجہ سے ابن الوقت کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف مسٹر شارپ کی ناراضگی کی وجہ سے مالی دشواریوں میں بھی

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۱۱

پھنس گیا پھر بھی وہ اپنی وضع تبدیل کرنے کو تیار نہیں ہوا یہاں تک کہ اپنی بارہ دری فروخت کرنے کو تیار ہو گیا لیکن ایک کرم فرما کی وفاداری اور وضع داری کی وجہ سے یہ بارہ دری سردست فروخت ہونے سے بچ گئی۔ اس نے ابن الوقت کو مزید روپئے بھی قرض دیئے جس سے اس نے دوسروں کے تقاضوں کو پورا کیا۔

اب ابن الوقت انگریزوں کے اس گروپ سے مل کر مایوس ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں انگریزوں کے تئیں جو برتری کا جذبہ تھا اس میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ جاں نثار نوبل صاحب کو ممبئی پہنچا کر جب لوٹتا ہے تو ابن الوقت کے حالات جان کر بہت تاسف کرتا ہے اور ابن الوقت سے کہتا ہے- آپ نے صاحب کو یعنی نوبل صاحب کو مطلع کیوں نہیں کیا تو ابن الوقت نے اس کا جواب یاس انگیز دیا۔ جاں نثار ابن الوقت کی حالت سن کر کہتا ہے:

> ''ہمارے صاحب اپنی ذات میں فرشتہ آدمی ہیں۔ میں نے خود صاحب ہی سے سنا اب اشراف انگریز ولایت سے بہت کم اترتے ہیں کوئی ذات کا بھٹیارہ ہوتا ہے، کوئی موچی، کوئی درزی، کوئی بوچڑ، کوئی نائی تو وہ ذات کی اصالت کہاں جائے۔'' [1]

اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے تعلیم حاصل کرنے اور جدید خیالات اور ترقیات کے ساتھ زندگی گزارنے پر زور دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انگریزوں کے دو گروپ تھے۔ یہ ایک گروپ اس بات کا حامی تھا کہ ہندوستانیوں کو ان کی اصلی وضع پر رکھا جائے ان کو مغرب کی ترقیات اور تعلیمات سے واقفیت نہ کرائی جائے اس لیے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ہمارے قبضے میں نہیں رہیں گے جیسا کہ انھوں نے انگریز نسل کے لوگوں ہی کو دیکھا تھا کہ آزادی

---

[1] ابن الوقت - ڈاکٹر نذیر احمد ص ۱۹۳

سے صحیح واقفیت کے بعد ۱۷۷۶ء میں برطانیہ سے اپنے ملک کو آزاد کرا لیا تھا۔ انھوں نے یورپ اور امریکہ کے صنعتی انقلاب کو دیکھا تھا۔ اور دوسرا گروپ اس بات کا حامی تھا کہ ہندوستانیوں کو ذہنی طور سے بھی غلام بنایا جائے۔ وہ اپنی تہذیب اور زبان وغیرہ کو بھول کر انگریزی معاشرت میں رنگ جائیں۔ اس کے بعد مختلف قوموں کا احساس ہی یہاں سے ختم ہو جائے۔

سرسید انگلش وضع اپنانے پر زور ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ ان کے اثر سے مسلمانوں میں مغربی تہذیب و تمدن کی دلدادہ ایک بڑی تعداد پرورش بھی پا چکی تھی۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کے بعد سرسید نے مصالحتی انداز فکر اختیار کیا۔ سفر انگلستان کے بعد وہ مغربی تہذیب سے اور بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی قوم کو اس تہذیب کی برکتوں سے مستفیض ہونے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ اپنے رسالوں اور تصنیفوں میں مسلمانوں کو اپنی قدامت پسندی ترک کرنے اور جدید ترقی یافتہ معاشرت کو اختیار کر کے لیے بڑی شد و مد سے تلقین کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں میں سرسیدؒ کی کوششوں کا شدید ردعمل ہوا۔ ان میں مخالفین کا گروہ اکثریت میں تھا۔ اس مخالف گروپ سے ایک درمیانی گروپ پیدا ہو گیا جس کا مصالحت کا نظریہ یہ تھا کہ وہ مغرب کی برکتوں سے مستفید بھی ہونا چاہتا تھا اور اپنی قدیم وضع کو برقرار بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اس گروپ نے سرسیدؒ کے گروپ سے زیادہ شدت پسند گروہ کو نقصان پہنچایا۔ اس طبقے میں کٹر مسلمانوں کے افراد زیادہ شامل ہونے لگے۔ اس کے برعکس سرسیدؒ کے طبقے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شروع شروع میں سرسید بھی مغربی تہذیب اپنانے میں اس لیے پس و پیش میں تھے کہ ان کا نظریہ تھا کہ کسی طرح ہندوستانی مسلمانوں اور حکومت کے درمیان مصالحت کرا دی جائے اور مسلمانوں کے انگریزوں سے تعلقات استوار رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ مغربی تہذیب ان کے

دل و دماغ میں اتنی زیادہ راہ پا گئی کہ وہ اپنے مقاصد کو فراموش کر بیٹھے اور بالکل انگریز پرست معلوم ہونے لگے۔ ابن الوقت کی انگریزی وضع اختیار کرنے کا مطلب وہی تھا جو سرسیدؒ کا تھا لیکن ابن الوقت کی پست پناہی کرنے والے نوبل صاحب کے بعد اس کو کوئی نہیں ملا بلکہ حجۃ الاسلام سے سابقہ پڑا۔ حجۃ الاسلام سے سرسیدؒ کا بھی ساتھ تھا۔ سرسیدؒ کو بھی ان کی قوم نے وہی خطابات عطا کیے جو ابن الوقت کے دیئے گئے۔ حجۃ الاسلام سرسیدؒ کو بھی بار بار اپنی تہذیب و تمدن کا احساس دلاتا رہا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:

> ''اسی طرح مسلمانوں کی ریفارم کو تو اسی وقت ریفارم کہا جائے گا کہ مسلمان مسلمان رہیں یعنی باپ دادا کے مذہب کے وضع کے پابند ہوں۔ دور سے الگ سے پہچان پڑیں کہ مسلمان ہیں اور پھر ان کے دلوں میں زمانۂ حال کے مطابق ترقی کی گدگدی پیدا کی جائے۔'' [1]

اب یہاں پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد بھی یہی چاہتے تھے کہ مغرب کی برکتوں کو تو ضرور حاصل کیا جائے مگر اپنی وضع کے ساتھ وہ اپنی اسلامی، مسلمانی تشخص چھوڑ کر مغربیت کے قائل نہیں تھے۔ حالاں کہ ڈپٹی نذیر احمد سرسید تحریک کے زبردست حامی تھے۔ سرسیدؒ کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ زندگی بھر سرسید کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے مگر اپنی پوری اسلامی تہذیبی وضع کے ساتھ۔ اس معاملے میں اکثر سرسیدؒ سے ان کا اختلاف بھی رہا ہے۔ چنانچہ اپنے ناول ابن الوقت میں اپنے انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے جس کو دیکھ کر سرسیدؒ کے صاحبزادے راس مسعود نے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ نے میرے والد محترم کو اپنے ناول میں

---

[1] ابن الوقت - ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۸۵

نشانہ بنایا ہے جس کے جواب ڈپٹی نذیر احمد نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ طور پر کیا ہے اب جو جیسا سمجھے اپنے حساب سے اس کو لے۔

ابن الوقت نے مغربی تعلیم وتہذیب کے زیر اثر اپنی وضع بدل لی تھی اور جدید ترقی کا زبردست حامی تھا بلکہ دلدادہ تھا مگر مسٹر شارپ جو کہ ابن الوقت کی وضع کے سخت خلاف تھے وہ بار بار ابن الوقت سے اپنی وضع بدلنے کے لیے کہتے تھے یہاں تک کہ ابن الوقت اور مسٹر شارپ سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی۔ ان سے ٹکرانے کے بعد انگریز قوم سے متعلق اس کی خوش فہمی متزلزل ہوگئی۔ وہ ان سے بھی مایوس نظر آنے لگا اور اپنی مصیبتوں میں ان سے مدد لینے کو تیار نہیں تھا اور انگریزی وضع کو آزادانہ طور پر اپنی وضع سمجھ کر استعمال کیے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم آزاد ہیں جیسی چاہیں وضع اختیار کریں۔ حجۃ الاسلام مسٹر شارپ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن اولوقت نے اپنی وضع بنگالیوں کی طرح آپ لوگوں کی برابری کے دعوے سے یا آپ لوگوں کو چھیڑنے کے لیے نہیں اختیار کی ہے بلکہ چند خوبیوں کی وجہ سے اپنے دل کے تقاضے کی وجہ سے اپنایا ہے۔ حجۃ الاسلام کے سمجھانے پر وہ سمجھ تو گئے مگر اس کی وضع بتدیل کرانے پر مصر ہیں اور اس کو معاف کرنے کی تنہا شرط یہی رکھتے ہیں کہ ابن الوقت اپنی وضع چھوڑ دے۔ ابن الوقت کہتا ہے کہ مسٹر شارپ میری وضع کے پیچھے کیا پڑے ہیں بلکہ ان کو اس طرح کے مواقع سے بہت زیادہ تکلیف پہنچنے والی ہے۔ ان کو اپنی ذہنیت سے کافی زک اٹھانی پڑے گی اور ابن الوقت نے اتنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ کہتا ہے کہ:

> ''ابھی تو انھیں بہت خلاف مزاج دیکھنا اور سننا ہوگا۔ وہ وقت قریب آ لگا ہے کہ اس ملک میں سول سروس کا امتحان ہوا کرے گا۔ کسی ملکی خدمت

کے لیے انگریزوں کی تخصیص باقی نہ رہے گی جیسی اب ہے۔ وائسرائے کی
کونسل میں برابر کے ہندوستانی بھی ہوں گے اور کوئی قانون بغیر ان کی
صلاح ومشورہ کے جاری نہ ہوسکے گا..........'' ۱

بعض نقاد ابن الوقت کو سرسیدؒ کی تمثیل اور نذیر احمد کو حجتہ الاسلام کے قائم مقام بتاتے ہیں، کچھ حجتہ الاسلام کی شکل میں علامہ شبلیؒ کو تلاش کرتے ہیں۔ ابن الوقت کی کردار نگاری کے سلسلے میں جتنا کچھ تحریر کیا جاچکا ہے اس سے بخوبی یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ سرسیدؒ سے اس کردار کی نسبت کہاں تک ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دل کی بات کو ابن الوقت کے کردار میں پیش کیا ہے۔ ابن الوقت کے پردے میں ڈپٹی نذیر احمد انگریزی پڑھنے کے قائل تھے لیکن مشرقی وضع داری کے ساتھ وہ مغربی دنیا کے تمام تر ترقیاتی پروگراموں کو اپنانا چاہتے تھے مگر سچے، پکے مسلمان کی حیثیت سے' گویا ان کو بھی دنیا کی ضرورت تھی مگر شریعت کے دائرہ میں اور انھیں نظریات کو جابجا سامنے کیا ہے اور کہیں کہیں اسی بات پر سرسیدؒ اور ان کا نظریاتی اختلاف سامنے آیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حجتہ الاسلام اور ابن الوقت کی آپسی گفتگو میں جزیاتی بحث کے ذریعہ جدیدیت کے تمام تر ارتقائی پروگرامات بطور خاص تعلیم اور اسی تعلیم کے حساب سے وضع قطع اور اس کے ضروری لوازمات کی بحث کی ہے۔ ان سب کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد وضع داری کے متعلق لکھتے ہیں:

''مذہب اسلام نے کوئی لباس مقرر نہیں کیا ہے اگر وہ مقرر کردیتا تو
اس کے آفاقی اور فطری مذہب کے ہونے میں فرق آجاتا۔ یہ بھی بتایا ہے
کہ ہندوستان میں کبھی کوئی قومی لباس مقرر نہیں ہے پھر بھی ہندوستانیوں کا

---

۱ ابن الوقت - ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۷۵

ایسا لباس ضرور ہے جو انگریزی لباس سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اس طرح
انگریزی لباس اختیار کرنے سے شعارِ قومی کی تذلیل ہوتی ہے۔" [1]

ڈپٹی نذیر احمد ایک مصلح کی حیثیت سے ہم مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی دنیاوی ترقیات میں پیش پیش رہنا چاہیے جہاں کہیں بھی ترقی کے نظریات ملیں انھیں ضرور بالضرور اپنانا چاہیے اور دنیا کی جدید تعلیمات کے جتنے عوامل ہیں بطور خاص سائنسی ایجادات سے متعلق اس میں مسلمانوں کو اہم رول ادا کرنا چاہیے مگر چوں کہ ڈپٹی نذیر احمد ایک بلند مرتبت عالم دین بھی تھے لہٰذا انھوں نے کہیں بھی دین کی رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ انسانی فطرت کے تمام تر فکر و شبہات کو ابن الوقت اور حجۃ الاسلام کے مکالمے کے ذریعہ دنیا کے سامنے لاکر رکھ دیا ہے کہ مسلمان چاہے جتنی بھی ترقی کرلے ارتقا کی تمام تر بلندیوں کو چھولے مگر ایک بہترین مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں انگریزوں کا جب غلبہ ہوا اور ہندوستانی ان کی جدید تعلیم، وضع اور سائنسی ترقیات کی طرف بڑھنا شروع ہوئے تو ڈپٹی نذیر احمد نے ایک عالم کی حیثیت سے مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کی حفاظت کی غرض سے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور اسی کو دنیا کے سامنے "ابن الوقت" کی شکل میں پیش کیا۔

ایامیٰ

ایامیٰ بیواؤں کی شادی کے موضوع پر بڑا اہم ناول ہے۔ یہ نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے ایک شرعی مسئلے سے متعلق عدم تعمیل کی بنا پر پیدا شدہ سماجی تشدد کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مسلمانوں میں ان کے خود ساختہ

---

[1] الحقوق والفرائض حصہ دوم ص ۲۷-۲۸

مذہب اور رسم ورواج کی پابندیوں کے باعث اکثر بیشتر بیوہ عورتیں عقد ثانی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ایسی زندگی کا المناک نقشہ نذیر احمد نے ''ایامی'' میں پیش کیا ہے۔ آزادی بیگم کی وصیت دراصل اس ناول کا خلاصہ ہے جس سے عقد ثانی کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ عقد ثانی کی ضرورت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

> ''ان بیچاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔'' [1]

اس ناول میں آزادی بیگ خواجہ آزادی کی لڑکی ہے۔ خواجہ صاحب ایک روشن خیال انسان ہیں مگر ان کی بیوی ہادی بیگم بے حد قدامت پسند واقع ہوئی ہیں۔ آزادی بیگم کی شادی کے سوال پر ماں اور باپ کے الگ الگ نقطۂ نظر نے آزادی بیگم کو بہت کش مکش میں ڈال دیا ہے۔ نذیر احمد نے اس کش مکش کو بڑے مؤثر انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ آزادی بیگم کے کنوارے پن سے اس کی بیوگی تک کے تمام احساسات وجذبات کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور معاشرے کے دوسرے غیر متوازن پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بلآخر آزادی بیگم اس معاشرے کی مظلوم خواتین کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول دلچسپ ہے اور نصیحت آموز بھی۔

اسی طرح ہندوؤں میں بیواؤں کی شادی مذہبی طور پر ممنوع تھی۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں مذہبی قانون کے خلاف ہندوؤں میں تحریک چل رہی تھی۔ راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی اور اس مذہبی قانون کی کھل کر مخالفت کی۔ ۱۸۳۳ء میں انھوں نے لارڈ ولیم بینٹنگ کی مدد سے رسم ''ستی'' کے خلاف ایک قانون پاس کرایا اور اس کو بند کرا دیا اور عقد

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) - ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۶۱

بیوگان پر بھی زور دیا۔ بنگلہ زبان میں ۱۸۹۰ء کے قریب اسی موضوع پر ایک ناول تصنیف کیا گیا تھا۔ ذرا بعد پریم چند نے بھی اس موضوع پر ''بیوہ'' کے عنوان سے ایک ناول تصنیف کی۔

تعداد ازدواج اور عقد بیوگان پر غور کرنے پر ایک دوسرے کے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خود قرآن میں بھی ایک جگہ اشاد ہوا ہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو شادی کر لو۔ اس میں اس بیوہ کی طرف اشارہ ہے جو صاحب اولاد ہو۔ اس زمانہ میں بیواؤں کی شادی ایک مسئلہ تھا کہ کون اس سے شادی کرے مگر اب جب کہ بیواؤں کی شادی کی کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی ہے پھر بھی رشتوں کی کمی کی وجہ سے اب بھی بہت سی بیوائیں شادی کے بغیر پڑی رہ جاتی ہیں۔ جس وقت یہ ناول لکھا گیا اس وقت بیواؤں کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی پھر بھی بہت سی بیوائیں بغیر شادی کے پڑی رہ جاتی تھیں۔ اس لیے اس موضوع پر ڈپٹی نذیر احمد کو اس ناول کے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دراصل ناول اصلاحی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم سماج کو چیلنج کرتے ہیں جو کہ بیواؤں کی شادی کو معیوب سمجھنے لگے تھے جو کہ ہندو سماج کے اثرات کی وجہ سے ایسا تھا۔

اس ناول کا موضوع اس قدر جامع تھا کہ ہر مذہب کا آدمی اس سے مستفیض ہو سکتا تھا۔ بیواؤں کا وجود جیسے مسلم گھرانوں میں باعث خطرہ تھا اسی طرح ہندوؤں کے گھروں میں بھی بیوہ کا وجود باعث خطرہ تھا۔ اس موضوع کی اہمیت کو منشی پریم چند نے بھی محسوس کرایا تھا۔ اسی لیے اپنے دور اوّل کے ناولوں میں اس موضوع کو اپنایا۔ مذہب اسلام کے تمام اصول کسی نہ کسی طرح سماج کو پاکیزہ بنانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ بیوہ کی موجودگی سے سماج میں گندگی پھیلنے کا خطرہ بہر حال ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ بیواؤں کی شادی کا سختی سے حکم دیتا ہے۔ عورتوں کی دوسری شادی پر پابندی

اور مردوں کو اس سلسلے میں چھوٹ ہونے کی وجہ سے بیواؤں کی تعداد تیزی سے بڑھتی ہے کیوں کہ مرد دوسری، تیسری شادی کافی عمر میں کرتا ہے اور مر مر کے بیواؤں کو اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اگر بیواؤں کی شادی پر پابندی نہ ہو تو وہ اپنی عمر کی عورتوں کو شادی کے لیے آسانی سے حاصل کر سکے۔

نذیر احمد نے اس مسئلے کو بالکل ہی الگ سطح پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کے سامنے کفالت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ اس پہلو پر انھوں نے زور تحریر صرف کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کی ایک انتہائی حد کو لیتے ہیں۔ آزادی خود کہتی ہے کہ:

> ''بیچاروں کے شوہر فوت کرتے ہیں نہ کہ وہ ضرورت جس کے لیے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔'' [1]

نذیر احمد نے اپنے اس ناول میں نکاح کی بنیادی ضرورت کو لیا ہے جس کے لیے شادی ہوتی ہے۔ ذرا غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کے اس انداز فکر میں جنس بھی کارفرما ہے۔ تنہائی اور دیگر ضرورتیں بھی شادی میں شامل ہیں اور غور سے دیکھا جائے تو نذیر احمد کا انداز فکر پریم چند سے زیادہ ترقی یافتہ اور جدید معلوم ہوتا ہے اور اپنے اندر پورے انسانی سماج کو سمیٹ لیتا ہے۔

نذیر احمد کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بیواؤں کی شادی کے لیے رشتے کی کمی ہے۔ وہ تمہیدی قصے میں لکھتے ہیں:

> ''بے شک مردم شماری سے ثابت ہوا ہے کہ جنگلی اور وحشی قومیں چھوڑ کر ہر جگہ عورتوں کا مجموعہ مردوں سے کچھ ہی بڑھا ہوا ہے مگر نہ اتنا کہ جدھر

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) - ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۶۱

آنکھ اٹھا کر دیکھو رانڈیں ہی رانڈیں نظر آجائیں۔'' [1]

نذیر احمد نے ایامیٰ کو محض مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھا ہے بلکہ سماجی، معاشی اور معاشرتی ہر لحاظ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر قدیم مسلم گھروں میں مغربی تعلیم کا اثر ہو رہا تھا۔ انھیں مغربی خیلات اور فکر کی بدولت ہی آزادی بیگم کو یہ جرأت ہو سکی کہ ان مردوں کے سامنے مرتے وقت عقد بیوگان کی اہمیت کو واضح کیا اور خود کو مثال کے طور پر پیش کیا۔

آزادی کی ذہنی تبدیلی اس کی شادی میں تو بے اثر رہی اپنی تمام کوششوں کے باوجود ماں کی قدامت پسندی کی وجہ سے اس کو وہیں شادی کرنی پڑی جہاں اس کی ماں (ہادی بیگم) کرنا چاہتی تھی مگر بیوہ ہونے کے بعد ان کی ذہنی بتدیلی کا اثر لوگوں پر ہوا اور ڈپٹی نذیر احمد نے آزادی بیگم کی اس ذہنی تبدیلی ہی کہ وجہ سے ان مولویوں کی ذہنی اصلاح کرنے کی جرأت کی جو پنجابی کٹرہ میں ان کے ظالم استاد بھی رہ چکے تھے۔ آزادی کے شوہر مولوی مستجاب بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے ان کی مولویت اپنے بدلے ہوئے ذہن کی بدولت چھڑادی اور ملازمت کے راستے پر لگادیا جہاں ان کا تھوڑے ہی دنوں کے بعد انتقال ہو گیا۔

شوہر کے انتقال کے بعد ایک بیوہ کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے اور اس کی زندگی میں کس طرح ایک خلا ہوتا ہے اور کس طرح وہ اپنی تنہائی کو بہلانا چاہتی ہے؟ انھیں سب نفسیات کو نذیر احمد نے اپنے ناول میں لکھا ہے۔ چنانچہ آزادی کے شوہر کا جب انتقال ہوتا ہے تو آزادی کی زندگی میں ایک خلا ہو جاتا ہے۔ مولوی مقتدیٰ کے وعظوں سے بھی بھرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ والدہ محترمہ بھی اپنا عیش و آرام ترک کے اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں لیکن آزادی کو اور بھی غمگین کیا۔ آزادی تنہائی

---

[1] ایامیٰ باہتمام منذر حمد طبع چہارم ص ۱

چاہتی تھی تا کہ دل کھول کر روئے لیکن اس کی والدہ کبھی اس کو تنہا چھوڑتی ہی نہیں یہاں تک کہ ماں بیٹی میں بھی دوری ہوگئی، ایک طرح سے کشیدگی ہوگئی ان دونوں کے درمیان۔ مگر اسی گھر میں آزادی کے والد اپنی بیٹی کے نفسیات سے واقف تھے اسی لیے سسرال سے جب بلاوا آیا تو اس کے والد فوراً رخصتی پر آمادہ ہوگئے لیکن آزادی چھ دنوں کے بعد اپنے سسرال سے واپس آ گئی اور اس مکان میں رہنے لگی جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کو تنہائی نصیب ہوئی تو خوب دل کھول کر رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اب اس کے دل کے بہلنے کی کوئی صورت نہیں تھی تو اس نے مایوس ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا مگر گناہ عظیم سمجھ کر خودکشی نہیں کر سکی۔

اس ناول میں نذیر احمد نے ایک بیوہ کے دل کی کیفیت کا بہت ہی جذباتی طور پر تبصرہ کیا ہے۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حادثات زندگی کے رونما ہونے کے بعد چند گھنٹے یا چند روز اس کے آس پاس رہا جائے یا اس کی دلجوئی کی جائے تو غم جلد سے جلد کم ہو جائے گا جب کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی غم کے بارے میں بہت زیادہ پوچھنے سے، سوالات کرنے سے دل اور بھی غمگین ہو جاتا ہے۔ اصول یہ کہتا ہے کہ اگر کسی بات کو بھولنا ہو تو اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا جائے تو جلدی ہی وہ بات بھول جائے گی جیسا کہ نذیر احمد نے آزادی کے کردار میں اس نفسیات کو پیش کیا ہے کہ آزادی چاہتی تھی کہ آزادی مل جائے یا پھر تنہائی میسر ہو جائے تو رو رو کر بھڑاس نکال لے اور دل ہلکا ہو جائے اور آزادی نے یہی کیا بھی۔

ایک بیوہ کی مجبوری کہیے یا ضرورت، آہستہ آہستہ آزادی کے بھی خیالات بدلنے لگے اور دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگی۔ خواجہ مشتاق کا بیغام بھی آیا لیکن یہ ایک سازش تھی جس کا مقصد صرف آزادی سے تلذذ جنسی حاصل کرنا تھا۔ آخر کسی طرح آزادی اپنی آبرو بچائی۔

چنانچہ آزادی چاہتے ہوئے بھی دوسری شادی نہیں کرسکی۔ آخر کار مرض الموت میں گرفتار ہوجاتی ہے اور ایک وصیت کے بعد مرجاتی ہے۔

ایامی نذیر احمد ایک کا ایسا ناول ہے جس میں نذیر احمد نے نفسیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس طرح کی نفسیات ان کے دوسرے ناولوں میں بھی ملتی ہیں لیکن ایامی تو مکمل نفسیاتی ناول ہی ہے۔ اس میں نذیر احمد نے ایک شریف مسلم گھرانے کی لڑکی کی نفسیات پیش کی ہے جو کہ بیوہ ہوچکی ہے کہ خواجہ مشتاق سے دھوکہ کھانے بعد بھی اس کے دل میں محبت کے جذبات بھر جاتے ہیں۔ آزادی کے ذریعہ ایک لڑکی کے عشقیہ جذبات کی ترجمانی نذیر احمد نے پہلی بار کی ہے کہ آزادی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن نہیں کر پاتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی محسوس کیا ہے کہ:

''نذیر احمد ایامی میں نفسیاتی تجزیہ کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔'' [1]

اس ناول میں نذیر احمد نے پرانی قدروں اور جدید تہذیب کو مقابلتاً پیش کر کے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ مولویت کے زیر اثر پورا سماج رہتا تھا اور وہ لوگ تمام تر عالمانہ حیثیت رکھنے کے باوجود بھی زمانے کی روش اور رسم ورواج سے یکسر خود کو بچا نہیں سکتے تھے اسی لیے وہ لوگ بھی بیوہ کے عقد ثانی کے پورے طور پر قائل نہیں تھے۔ مگر جدید تعلیم کا جب دور ہوا زمانے کی قدریں جب بدلیں نئی روشنی سے جب لوگ آشنا ہوئے تو بیوہ کی دوسری شادی کے بہت سارے مثبت پہلو ان کے سامنے آئے چنانچہ خود آزادی کے والد صاحب نے مشن اسکول میں اوسط جماعت تک تعلیم پائی تھی اور اس کے بعد ان کے تعلقات انگریزوں سے ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس ہادی بیگم مولویوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ نذیر احمد نے دونوں کے مباحثے کو بہت ہی

---

[1] سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا۔ سید عبداللہ ص ۳۰۸

دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے مگر ہادی بیگم کی فتح اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بچیوں کی پرداخت انھیں کے ہاتھوں تھی۔ اس موقع پر نذیر احمد نے ایک اور بہت ہی اہم نقطہ پیش کیا ہے کہ بچوں کی پرداخت ماں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے چنانچہ مائیں اگر کسی تحریک کو کسی مثبت اصلاحی پہلو کو آگے بڑھائیں تو بہت جلد بچے اس کو قبول کریں گے اور اسی طرح ایک بدلے ہوئے نظام کو سماج میں بہت ہی آسانی سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ آزادی کے گھر میں کبھی مغربی تہذیب کی تھوڑی سی چھاپ اس کے والد محترم کی وجہ سے تھی اس لیے آزادی اپنی شادی کے متعلق سوچتی ہے اور یہ کشمکش شادی تک جاری رہتی ہے۔ شادی کے بعد اس کا ٹکراؤ سسرال والوں سے ہوتا ہے چوں کہ آزادی کو ان کا طرز زندگی قطعی پسندی نہیں تھا خود نذیر احمد بھی کٹر مولویت کے بالکل ہی قائل نہیں تھے۔ خود بھی مولویت کی قدامت پسند اور ریاکاری سے بیحد ناخوش رہتے تھے۔ ان کے طور طریقے بھی ان کو پسند نہیں تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ان مولویوں نے مسلمانوں کو جتنا ضرر پہنچایا تھا اتنا کسی دشمن نے بھی نہ پہنچایا ہوگا۔ مولوی تھوڑی سی سطحی مذہبی معلومات سے مسلم عوام کو بیوقوف بنا کر لوٹتے تھے۔ آزادی مولویانہ زندگی کے متعلق اسی طرح سوچتی ہے:

> ''یہ باتیں یاد کر کے آزادی مولویوں کی طرف کو ڈھلتی جاتی تھی مگر آخر تھی تو نوجوان لڑکی، ایک دن اس کو خیال آیا کہ مولویانہ زندگی کچھ بھی ہو اُداس اور بے رونق تو ضرور ہے۔'' [1]

نذیر احمد نے سماج کی ایک بہت ہی حیرت انگیز مگر سچی حقیقت پیش کی ہے۔ انھوں نے عاشقوں کے خطوط، ان کی جملہ بازیاں اور ان کے آزادی کے گھر کے آس پاس منڈلانے کی

---

[1] ایامی (پہلا ایڈیشن)، مطبع فیضی دہلی ص ۵۲

حالت کی عمدہ تصویر کھینچی ہے یہاں تک کہ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی تھی اس میں کسی نہ کسی عاشق کا پیغام نکل آتا تھا یعنی خط، رقعے، نظمیں، غزلیں وغیرہ۔ اس کا سبب کیا تھا؟ اس کی محرک کون سی چیز تھی؟ اس کو نذیر احمد نے بہت ہی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ دراصل وہ آزادی کی بیوگی کی کمزوری تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔ آزادی خود بھی اس کے اسباب پر غور کرتی ہے کہ:

> ''اگر میں واقعی خوبصورت ہوں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں، خوبصورتی کچھ رنڈاپے سے نہیں آتی مگر لوگ جانتے تھے کہ ایک کے نکاح میں ہے اس سے کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا اب دیکھا کہ اس کا کوئی سرپرست نہیں تو عاشقی کا دم بھرنے لگے، تو اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں' قصور اگر ہے تو میرا ہے۔ آج میں کسی کی ہو رہوں تو عاشقی معشوقی سب کا خاتمہ ہے۔''[1]

ڈپٹی نذیر احمد آزادی کے شوہر کے ساتھ زندگی اور بیوہ ہو جانے کے بعد کی زندگی کا تقابلی تجزیہ پیش کرتے ہیں کہ آزادی کے مکان کی دو تصویریں نظر آتی ہیں ایک اس کے شوہر کی موجودگی کی اور دوسری اس کی بیوگی کی۔ ایک حالت میں اس کی دیواریں آزادی کی عزت و ناموس کی محافظ تھیں دوسری حالت میں وہی اس کی رہزن بن گئی ہیں۔ یہی فضا اب اس کو ڈراؤنی اور خوفناک معلوم ہوتی ہے اور یہی انسان اب خونخوار اور درندے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اس کو چیر پھاڑ کے رکھ دیں' یہی لوگ تو پہلے بھی تھے۔

یہی خیال ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ خود کلامی اور ذہنی کشمکش کے درمیان اس کی آخری زندگی تک پہنچ جاتا ہے جہاں آزادی اپنی باقی ماندہ قوت کو بڑی ہمت سے یکجا کرتی ہے

---

[1] ایامیٰ (طبع چہارم) ص ۱۴۳-۱۴۴

اور مجمع عام میں بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کرتی ہے۔

نذیر احمد اگر چہ انسانی نفسیات کے جدید تجزیئے سے واقف نہیں تھے لیکن انھیں انسانی نفسیات سے اعلیٰ درجہ کی واقفیت تھی۔اس ناول میں انھوں نے مولویوں کا اچھا ذہنی تجزیہ کیا ہے جو کہیں کہیں بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔اس ناول میں بیوہ کے عقد ثانی کے داخلی پہلو کو لیا گیا ہے جس میں ایک بیوہ کی حیاتیاتی ضرورتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔آزادی کی تندرستی اور اس کی مسکان سے ہی اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس ناول میں عورت کی مادی کشش کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

آزادی کے کردار میں نذیر احمد ایک مخفی انداز میں عورتوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔چنانچہ وہ اصغری بیگم کے حوالے سے یہ بات سامنے رکھتے ہیں کہ اس کے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے شوہر اور اپنی شادی کے متعلق خود سوچے جب کہ آزادی ہر وقت سوچتی ہے، ہر بات سوچتی ہے، وہ اس کا احساس رکھتی ہے کہ اس کے ماں باپ کے تعلقات، باہمی خیالات اور نظریات میں اختلاف کے سبب خوش آئندہ نہیں ہیں اس لیے وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو پر آزادانہ سوچتی ہے لیکن ہادی بیگم (آزادی کی ماں) کی شخصیت کے آگے بس سوچتی ہی رہ جاتی ہے اور اسی طرح وہ اپنے شوہر مولوی صاحب کو بدلنے کو سوچتی ہے۔بیوہ ہوجانے پر وہ زندگی گذارنے کے طریقوں پر سوچتی ہے اور جہاں بہت سے طریقے اس کے ذہن میں آتے ہیں وہیں وہ طوطا، مینا بھی پالنے کی سوچتی ہے۔

نذیر احمد نے طوطا مینا کو لے کر ایک نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک طرح سے جنسی جذبات کو بہلانے کے طریقے ہیں۔چوں کہ آزادی کے جذبات ابھی شعور کی سطح پر تھے لاشعور کی چیز نہ بن سکے تھے اس لیے وہ ان مشغلوں سے نہیں بہل سکتی تھی۔ایسا اکثر ہوتا ہے

کہ اس قسم کے شعوری جذبات جب کسی باہری دباؤ سے لاشعور میں چلے جاتے ہیں تو اس قسم کے مشغلوں سے دل بہل جاتا ہے۔ لوگ جانوروں کو پالنے کی طرف راغب ہوجاتے ہیں اور اپنی جنسی آسودگی انھیں مشغلوں میں تلاش کر لیتے ہیں۔ ان مشغلوں کو اکثر جنسی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

آزادی کے لیے بھی یہ مشغلے تسکین بخش ہو سکتے تھے اگر اس کے جذبات کچھ نچلی سطح پر چلے جاتے۔ نذیر احمد نے اس وقت اس قسم کے علامتی انداز سے ایک عورت کے جنسی اور حیاتیاتی ضرورتوں کو ظاہر کیا۔ آزادی اگر کنواری ہوتی تو بہل سکتی تھی لیکن بیواؤں کو اس طرح بہلنا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کے رموز و اسرار سے واقف ہوتی ہیں۔ آخر اس کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس مرض کا علاج صرف موت ہی ہے۔

نذیر احمد کے اس ناول کا اثر یہ ہوا کہ اس کی تصنیف کے بعد دہلی میں بے شمار بیواؤں کی شادیاں ہوئیں۔

اس طرح آزادی بیگم نذیر احمد کا بالکل نیا نسوانی کردار ہے۔ انھوں نے مرد و عورت کے رشتوں کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ محبت کے تمام شعبوں کو برتا لیکن شایداى۔ایم فارسٹر کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ افلاطونی محبت روزانہ زندگی کا معمول نہیں بلکہ صرف کتابوں میں ملتی ہے دل بدلتا رہتا ہے۔ اگر اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو تو دیکھیے کتنے مجنوں اور کتنے فرہاد پیدا ہوتے ہیں۔ مغرب میں اس قسم کے کردار مفقود ہیں اور آج محبت اور ہوس میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو اپنے قصے کا موضوع بنایا یہاں تک کہ روایتی محبت کو بھی انھوں نے اپنے قصوں میں جگہ نہیں دی۔ مخالف جنس کے آپسی

اختلاط اور ارتباط کے جتنے روزانہ زندگی کے فطری انداز ہوسکتے ہیں انھوں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔

یہاں ایک بیوہ کی زندگی کو جس انداز سے ۱۸۹۱ء میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیاں یہ ان کے لیے فخر کی بات نہیں ہے کہ آج تک شاید ہی کسی نے اس مسئلے کو اس انداز سے دیکھا ہو۔ اس کے ذریعہ نذیر احمد نے نفسیاتی ناول نگاری کی روایت اتنے پہلے قائم کردی تھی جس میں آج ہم کو سب سے زیادہ افسانوی ادب ملتا ہے۔ بیوہ کی زندگی پر بنگلہ زبان میں اس ناول سے ذرا ہی پہلے ۱۸۸۷ء میں ایک ناول لکھا گیا تھا۔ اس میں ایک بیوہ کی محبت کی کہانی ہے لیکن انداز وہی فرسودہ ہے لیکن نذیر احمد کے اس ناول میں انداز ایسا ہے جیسے اپنے آپ کو تلاش کرنے کا ہوتا ہے اور یہی جدید ترین فکر فن کی بنیاد ہے جس کی داغ بیل نذیر احمد اتنے پہلے ڈال گئے تھے۔ شروع میں انھوں نے اپنے بچوں کے لیے کتابیں لکھیں اور آخر میں خود اپنے لیے۔[1]

رویائے صادقہ

رویائے صادقہ نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔ یہ ناول اول بار مطبع صدیقی دہلی سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۴ء کی روداد کے ایک اشتہار میں بھی اس کا یہی سال اشاعت دیا ہوا ہے۔ اس اشتہار میں بھی اس ناول کے موضوع اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مطابق اس ناول میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے اس میں شکوک وشبہات کو دخل ہو ہی نہیں سکتا۔ ضمناً اس میں دوسرے مفید مضامین بھی آ گئے ہیں۔[2]

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۲۶۷

[2] روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۴ء لیکچر نذیر احمد ص ۳۲

اس ناول میں ڈاکٹر نذیر احمد نے معاشرت اور مذہب سے متعلق اپنے خیالات اور معلومات کا قدرے کھل کر اظہار کیا ہے۔ ناول کی ہیروئن صادقہ ہے جو ہمیشہ سچے خواب دیکھنے اور بیان کرنے کی بنا پر ایک ایسی لڑکی مشہور ہو چکی تھی جس پر جنات کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی بنا پر ۲۲ رسال کی عمر تک اس کی شادی کا کوئی پیغام نہیں آیا حالاں کہ اس کی دو چھوٹی بہنیں پہلے ہی بیاہی جا چکی تھیں۔ سید صادق جو کہ علی گڑھ میں پڑھتا ہے اور ایم۔اے کا طالبعلم ہے صادقہ سے شادی کے لیے اس کے والد کو خط لکھتا ہے۔ یہ خط مختصر سا ہے۔ صادقہ کے والد پیغام منظور کر لیتے ہیں مگر سید صادق جو کالج کی انجمن الاصلاح کی سب کمیٹی کا ممبر ہے اپنی شادی سے قبل اس انجمن میں شادی بیاہ سے متعلق ایک مباحثہ منعقد کرتا ہے۔ اس مباحثے اور اس کی روداد میں معاشرتی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے وہ اہم ہے۔ اس بحث میں مسلمان گھرانوں میں پردے کے رواج، عورت کی حیثیت، دوسرے مذاہب (خصوصاً عیسائی) کی عورتوں سے شادی اور اس کا نتیجہ، ذاتی حسب ونسب کی اہمیت اور شرم وحیا کی تعریف اور تجرد کی حقیقت پر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سید صادق عقلی مذہب کا قائل ہے اور زندگی کے ہر مسئلے کو عقل سے حل کرنا چاہتا ہے مگر ایک وقت اس پر ایسا گذرتا ہے کہ وہ عقل اور عقیدے کی بحثوں میں پڑ کر ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آخر ایک دن وہ انھیں اخلاقی مسائل کی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ یک بیک اس کے منھ سے یہ کلمات نکلے:

''اور خدا اگر واقعی تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہل مذہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو ورطہ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال دے۔''

یہ کلمات سید صادق کے منھ سے نکلے تھے کہ صادقہ خواب سے بیدار ہوئی اور اس نے کہا

کہ میں نے ایک لمبا خواب دیکھا ہے جس میں تم ایک بزرگ کے سامنے مذہب کے بارے میں اپنے شکوک بیان کر رہے ہو اور وہ تمہاری بات کا نہایت تسلی بخش جواب دے رہے ہیں۔

دراصل صادقہ کا یہ خواب ہی نذیر احمد کے ناول کا اصل مقصد کہا جا سکتا ہے۔ اس خواب میں نذیر احمد نے ایک بزرگ کے ذریعہ سید صادق کی ذہنی کشمکش اور شک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش میں زور قلم صرف کر دیا ہے۔ انھوں نے ان تمام مسائل پر طبع آزمائی فرمائی ہے جو ہر عقلی و اعتقادی انسان کے مسائل ہوتے ہیں۔ مثلاً وجود باری تعالیٰ اور وحدانیت، عاقبت، مذہب کی ضرورت، دین کا دستور العمل، عبادت کی اہمیت، مقلد اور غیر مقلد میں نفاق، شیعہ و سنی فرقوں میں تصادم، عقلی و نیچری فلسفہ حیات وغیرہ وغیرہ۔ نذیر احمد کے سامنے ان موضوعات کو ضبط تحریر میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مغربی تعلیم کے اثرات سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کو مذہب اسلام سے گمراہ ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔[1]

رویائے صادقہ خالص مذہبی موضوع پر مبنی ہے۔ نذیر احمد کی مذہبی دلچسپی یہاں اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ناول دینیات کا ایک رسالہ معلوم ہونے لگتا ہے جس کو نذیر احمد ایم۔اوکالج کے دینیات کے نصاب میں داخل کرانا چاہتے تھے اگرچہ کچھ وجوہات سے نصاب میں شامل تو نہیں ہوسکا مگر طلبا کے لیے مذہبی مسئلے میں یہ ناول چراغ راہ کا کام ضرور دیتا رہا۔ نذیر احمد کے پہلے چار ناولوں کے برعکس یہ ناول آپس کے تصادم اور کشاکش کو ختم کرنے کے لیے لکھا گیا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں درخواست کی ہے کہ اپنی مناظرانہ فطرت کو چھوڑیں اور مذہب کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس کو مشغلہ نہ بنائیں، وہ

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) - ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص ۶۳

جہادی مسلمان نہ بنیں بلکہ اجتہادی مسلمان بنیں۔ [1]

دراصل اس زمانہ میں مذہبی مباحثے کا بیحد رواج تھا۔ مسلم عوام کا کافی بیش قیمت وقت برباد ہوجاتا تھا۔ باہم آپسی جھگڑے بھی پیدا ہوتے تھے۔ انھیں تمام خرابیوں کے سدباب کے لیے یہ ناول لکھا تھا۔ ایک طریقہ سے یہ ناول مسلمانوں کے مختلف فرقوں اورنظریات کے درمیان ایک صلح کل کا درجہ رکھتا ہے۔ ویسے مذہب بھی دنیا کے ادب عالیہ کا موضوع رہتا ہے۔ انگلش ادب میں جارج ایلیٹ کے ناول اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کا موضوع بھی مذہب اور فلسفہ ہی رہا ہے۔ نذیراحمد نے بھی اس ناول میں مذہب اسلام کو ایک فلسفیانہ دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس ناول میں مغربی معاشرت کے خلاف خاموش کشمکش جاری رہتی ہے۔ نذیراحمد نے معاشرت کی بنیاد پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں میں مذہب کا صحیح شعور پیدا ہوجائے تو کیا معنی کہ ان کو اسلامی معاشرت یا مشرقی تہذیب سے دلچسپی پیدا نہ ہوجائے۔ اس ناول میں صادقہ کے پیر طریقت خود نذیراحمد ہیں جو ایک بزرگ کی شکل میں اس کے طویل خواب میں آتے ہیں اور اپنا تعارف اپنے گذشتہ واردات قلب اور افکار ذہنی کو سمجھانے کی کوشش میں کرتے ہیں۔ یہاں نذیراحمد نے اپنی اس ذہنی کشمکش کو پیش کیا ہے جس سے وہ دہلی کالج کے طالبعلمی کے زمانے میں گذر چکے تھے۔ اپنے لکچر میں نذیراحمد نے اپنی ذہنی کشمکش کے متعلق کافی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

صادقہ کی باتوں سے ایک ایسی لڑکی کے ذہن کی عکاسی ہوتی ہے جس کی شادی میں بہت تاخیر ہوچکی ہے خصوصاً صادقہ اور اس کی سہیلی ہمراز کی گفتگو عمیق مشاہدہ کی غماز ہے اور بے حد

---

[1] رویائے صادقہ (دیباچہ) ص ۴

پرمعنی اور دلکش ہے۔ صادقہ کے طویل خطوں اور حالات کے بیان سے اس کی سیرت نگاری کی گئی ہے۔

اس معاشرے میں نذیر احمد خود ایک نئے آدمی تھے جو مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ اور نئے سماجی اور سیاسی حالات کی وجہ سے وجود میں آ گئے تھے۔ انھوں نے خود کو اس دور کے حالات اور معیاروں کی روشنی میں رکھ کر خود اپنا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مطالعہ کا یہ تصور جدید ترین تصور ہے۔

رویائے صادقہ میں نذیر احمد ایک انسان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "آدمی اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کی مجموعی حالت کے اعتبار سے، ورنہ اس کی بہت سی باتیں تو حیوانوں سے ملتی ہیں کہ انھیں کی طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا ہے اس میں کئی خواص نباتات کے ہیں کہ اس میں بالیدگی ہے پھولنے پھلنے کے عوض اس کی نسل چلتی ہے۔ درختوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کے مزاج کے مطابق پھل لگتا ہے۔" [1]

نذیر احمد نے اس ناول میں بھی بعض جگہ اپنی ذہانت اور اپنے مشاہدے کا کمال دکھایا ہے۔ میاں بیوی کی نوک جھونک کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول سے مخالف ماحول میں زندگی گذارنے کا درس ملتا ہے جس سے انسانی سماج میں کوئی گڑبڑی نہ ہو اور سماج میں کسی طرح کا عدم توازن اور غیر اعتدالی نہ ہو۔ یہی اس ناول میں فلسفہ حیات کا درجہ رکھتا ہے جس کی طرف اس کے دیباچہ میں اشارہ بھی ہے۔

---

[1] رویائے صادقہ - نذیر احمد ص ۷۰، ۷۱

ان الفاظ پر نذیر احمد زندگی کے اس مسلسل رزمیہ کو ختم کر دیتے ہیں کہ:

''اگر بعض یا سب کے سب غلط ہوں تاہم میرا دل مطمئن ہے کیوں کہ میں نے اس کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجھ کو جتنی سمجھ دی گئی ہے اس سے بڑھ کر مجھ سے باز خواست نہیں ہوسکتی۔ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا انتھا یعنی خدا نے جتنا جس کو دے رکھا ہے اس سے بڑھ کر کسی کو تکلیف دینی نہیں چاہتا۔ اب بھی مجھے کبھی کبھی اختلافات اور اعتراضات کا خیال آیا کرتا ہے لیکن پہلے مجھ کو جو پہاڑ معلوم ہوا کرتا تھا اب میں اس کو پھونک مار کے اڑا دیا کرتا ہوں۔ میں نے اصول ہی ایسے ٹھہرا رکھے ہیں کہ وہ اعتراضات کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔'' [1]

چنانچہ نذیر احمد زندگی میں عدم توازن اور لوگ ایک دوسرے کے چکر میں پڑ کر اپنا دین اپنا مذہب اور اپنی آخرت نہ خراب کر دیں اس واسطے انھوں نے اپنی ساری دینی تعلیمات کو ایک بزرگ کے کردار کی شکل میں اس ناول میں ظاہر کیا ہے اور حقیقت میں وہ بزرگ خود نذیر احمد کی اپنی ذات ہے اور صادق جو کہ اس ناول کا ہیرو ہے ایک مخاطب کی شکل میں اپنی بات دنیا کے سامنے رکھنے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اور اسی سلسلے کی کڑی صادقہ بھی ہے اور اس کے سچے خواب بھی انھوں نے انسانی سماج کی نت نئی فضول رسموں اور دیگر مذہبی اختلاف کو دنیا کے سامنے لا کر یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ حالات جیسے بھی مخالف کیوں نہ ہوں انسان اگر باشعور ہے اور تعلیمی لیاقت رکھتا ہے تو قوت ادراک سے اپنی زندگی میں سماجی، مذہبی ہر طرح کا اعتدال قائم کر لیتا ہے۔ چنانچہ مذہب کے بارے میں

---

[1] رویائے صادقہ - نذیر احمد ص ۲۱۶

جتنے طرح کے اختلافات آج مسلمانوں میں رونما ہو رہے ہیں یا ہیں ڈپٹی نذیر احمد ایک بزرگ اور صادق کے مکالمے کے ذریعہ دنیا کو درس دے رہے ہیں۔ جیسے مقلدوں اور غیر مقلدوں میں اکثر اختلافات فروعی اور غیر ضروری باتوں میں ہیں جن کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیے۔ مثلاً آج کل مقلدوں اور غیر مقلدوں میں اختلافات نماز میں آمین زور سے پکا کر کہنی چاہیے یا آہستہ، ہاتھ سینے پر باندھے جانے چاہیے یا اس سے نیچے باندھنا چاہیے لیکن ہم دیکھتے ہیں تو مسائل مختلف فیہ میں کوئی بھی شرط نماز نہیں' شرط نماز ہے طہارت، استقبال قبلہ، قرأت، قیام وغیرہ۔ علاوہ ازیں سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ کتنے مسلمان اس لیاقت کے ہیں اور ان کی دینی معلومات اس درجہ کی ہے کہ ان کو ائمہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو یا وہ ائمہ کے اختلاف میں محاکمہ کر سکیں۔ ایسے لوگوں کو یعنی اس ملک کے اور اس وقت کے مسلمانوں کو تقلید کے سوا کیا چارہ ہے۔ رہی یہ بات کہ نفس شرعی کے ہوتے دیدہ و دانستہ اس کے خلاف امام کی رائے پر عمل کیا جائے۔ شاید کوئی احمق سے احمق مسلمان بھی اس کا قائل نہیں۔ غرض سارے فسادات ضد اور سخن پروری کے ہیں ورنہ مسلمان کو مسلمان سے اختلاف کرنے کے معنی کیا؟"

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد نے ایک بزرگ کے لبادہ میں اپنے ذاتی عقیدے مذہب کے بارے میں منکشف کیے۔ جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سرسید کے سچے جانشین کی حیثیت رکھتے تھے ان کے دست راست تھے اگرچہ کہیں کہیں جزیاتی اختلافات بھی تھے اور دنیا جانتی ہے کہ سرسیدؒ فرقہ نیچر کے ماننے والے تھے اور نذیر احمد بھی فرقہ نیچر کے ماننے والے تھے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ:

"نیچری ابن الوقت ہیں یعنی اس زمانے کی پیداوار۔ زمانے کا رنگ

تو دیکھو کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں انگریزی عملداری ہے اور مطمئن کہ ایسا امن ہندستان کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اسی امن کا دوسرا نام ہے آزادی۔ ہر شخص عاقل مختار ہے جو چاہے سو کرے بشرطیکہ دوسروں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔ سرکار ایک دوسرے کی آزادی میں کیوں خلل انداز ہونے دے گی جب کہ رعایا کی آزادی میں اپنا خلل انداز ہونا جائز نہیں سمجھتی۔"[1]

اسی طرح سوال و جواب کے پیرائے میں نذیر احمد اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ نیچری فرقہ کے لوگ دعا، قدرت اور وحی معجزات، ملائکہ، شیطان، جنت دوزخ ایک چیز بھی انھوں نے نہیں چھوڑی جس میں عقلی تکے نہ چلائے ہوں جب کہ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ:

"اگرچہ دنیا کے امن و انتظام میں حکام ظاہر کو دخل ہے مگر نہ مذہب جتنا۔ آج دنیا کے تمام لوگوں کو (صرف معدودے چند نیچریوں کی نہیں منھ سے کہنے کی سند نہیں بلکہ واقعی میں تہہ دل سے) یہ رائے ہونے دو کہ خدا نہیں ہے اور جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکا۔ پھر دیکھو دنیا کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ فرانس اور اٹلی نے حکماً مذہب کو انتظام سے خارج کر کے کیا پھل پایا۔ مردم شماری گھٹ گئی، جرائم کی تعداد بڑھ گئی، ملک سے برکت سلب ہو گئی تو ہار کر پھر چاہتے ہیں کہ حسب دستور سابق مذہب کو رواج دیں۔ مذہب سے علیحدہ ہو کر نیکی دنیا میں رہ ہی نہیں سکتی۔ اس جگہ مذہب سے مراد ہے یہی خیال کہ خدا اپنی ذات سے دنیا میں تصرف کرتا ہے وہ اسباب کا محکوم یا محتاج نہیں۔"[2]

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۱۱۴

[2] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۱۱۵۵

چنانچہ صادق نے اپنے نکاح سے پہلے کالج میں جو شادی، نکاح سے متعلق سمینار کیا اس کے سامنے اس صادقہ کے تمام تر خواب کے حالات بیان کیے اور کہا کہ یہ خواب جو میرے بارے میں دیکھا اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ میں نے خواب کو زبانی نہیں سننا چاہا بلکہ ان سے کہا کہ دو۔ وہ لکھتی جاتی تھیں اور میں برابر بیٹھا ہوا دیکھتا جاتا تھا۔ میرے جتنے سوالات ہیں جوبات میرے ذہن میں تھی وہی ان کے قلم سے نکلتی تھی۔ یہ رسالہ جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہیں وہی خواب ہے اور جنھوں نے دیکھا ہے انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ہے۔ اس کے مضامین میں ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خواب دل سے نہیں بنایا گیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جنھوں نے یہ خواب دیکھا ہے اس کی بعض باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتیں اگرچہ ان کے خواب کو میں ان فوائد میں شمار کرتا ہوں جو نکاح کی وجہ سے مجھ کو حاصل ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ ہر ایک کے نکاح کا لازمی نتیجہ نہیں ہے اس لیے اس کو کمیٹی میں پیش کرتے ہوئے تامل کرتا تھا کہ نہیں معلوم اس کو اغراض کمیٹی میں داخل بھی سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر مجھ کو اس خواب میں ایسی مسرت ہوئی ہے کہ آپ صاحبوں کو شریک کیے بدوں مجھ سے رہا نہیں گیا اور مطلب بھی ایسا اہم ہے کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی مطلب ہو نہیں سکتا۔

صادق کا بیان سن کر لوگوں کے شوق تو اس قدر مشتعل ہو رہے تھے کہ چاہے ساری رات ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے مگر خواب ابھی سنایا جائے لیکن گفت وشنید کے بعد آخر یہ رائے قرار پائی کہ نہیں خواب کو بڑے اطمینان سے سننا ہوگا اور عجب نہیں کہ کسی کسی موقع پر بحث بھی پیش آ جائے۔ ختم ہونے تک کمیٹی کے آئندہ اجلاس اسی خواب کے لیے وقف رہیں۔ لوگوں نے بہتر چاہا کہ ان کو کتاب مستعار دی جائے اور کمیٹی سے خارج، ان کو اس کے پڑھنے اور دیکھنے کی

اجازت مگر پریسی ڈنٹ نے اس کو منظور نہ کیا اور کتاب قفل میں بند کی گئی۔ جب کمیٹی کا اجلاس ہوتا تو نکالی جاتی لوگ سنتے اور سر دھنتے۔ اس پر بحث بھی اتنی ہوئی کہ کسی مضمون پر نہ ہوئی ہوگی۔ انجام یہ ہوا کہ کمیٹی نے بالاتفاق ریزرویشن پاس کیا کہ

''جو اس کتاب جتنی باتیں بھی نہ جانتا ہو اس کا اسلام کیا۔''

پھر تو کالج کا کوئی طالبعلم نہ تھا جس کے پاس اس کی چھپی ہوئی ایک کاپی نہ ہو۔ اس طرح مولوی ڈپٹی نذیر احمد نے خواب کے ذریعہ اسلامی معلومات کا خزانہ اکٹھا کر دیا۔ لوگوں کے دلوں میں نت نئے انداز کے سوالات سر اٹھائے رہتے ہیں کہ اسلام میں ساری باتیں سارے احکامات ایک جیسے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ایک ہیں' قرآن ایک ہے۔ حدیثیں سب کی سب اللہ کے رسول کی ہیں تو عقائد کے اعتبار سے اعمال کے اعتبار سے اتنے سارے اختلافات کیوں؟ انھیں سب باتوں کو خواب کے سہارے ڈپٹی نذیر احمد نے ایک بزرگ کی شکل میں ایک کردار بنایا اور صادقہ نام کی ایک لڑکی کو پیش کیا اور سارے سوالات کے جوابات دے کر لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شک وشبہات کو اور فکر کو نہ صرف یہ کہ دور کر دیا بلکہ مطمئن بھی کر دیا۔ اسلامی فلسفہ سے متعلق یہ ایک لاجواب کتاب ہے۔ [1]

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۱۱۷۷

باب چہارم

ڈپٹی نذیر احمد کے تراجم وتفاسیر میں لسانی وادبی جدت پسندی

زبان وادب کی دنیا میں نذیر احمد کی شہرت صرف ان کی ناول نگاری کی وجہ سے نہیں، بلکہ انھیں ادب میں بلند مقام دلانے میں ان کے تراجم اور مذہبی تفاسیر وتصنیفات بھی شامل ہیں۔ بعض ناقدینِ ادب تو ان کی ادبیات میں ان کے ناولوں کی جگہ ان کے تراجم کو زیادہ اہم تصور کرتے ہیں کیوں کہ نذیر احمد کا فن نسبتاً ان کے تراجم اور تفاسیر میں زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔

اس حقیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ طبع زاد مضامین کی طرح ترجمے کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے بلکہ غیر معیاری تصانیف پیش کرنے سے کہیں زیادہ سودمند یہ ہے کہ کسی مستند کتاب کا ترجمہ ہی کردیا جائے۔ایک عمدہ اور اچھا ترجمہ کرنے کے لیے بہت ہی سخت محنت کی ضرورت ہے طبع زاد مضامین انسان آزادانہ طور پر کسی مضمون کو لکھ سکتا ہے مگر ترجمہ میں اصل متن کا خیال رکھنا پڑتا ہے اس کے عمدہ ودیگر مواد کو فراہم کرنے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔مصنف ایک زبان سے کام چلا سکتا ہے لیکن مترجم کو دو زبانوں کا اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ایک وہ زبان جس کا کہ وہ ترجمہ کررہا ہے اور دوسری وہ زبان جس میں وہ ترجمہ کررہا ہے اگر ترجمہ مزید زبانوں کا جانکار ہے تو ترجمہ کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے اور دوسرے مترجم کو تصنیف کے ہم عصر ترقی یافتہ زبانوں سے واقفیت اور مقامی زبان سے باخبر ہونا بھی ترجمے میں معاون ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مترجم کو تصنیف کے مواد میں عبور حاصل ہونا چاہیے اس لئے کہ جس طرح کا ترجمہ اس کو کرنا ہے اس میں اس کی دسترس نہیں ہوگی تو ترجمہ بے حقیقت ہو جائیگا جیسے سائنس کی کسی

کتاب کا ترجمہ کرنا ہو یا کسی شاعر کی شعری تصنیف کا ترجمہ کرنا ہو اگر مترجم کو سائنس کا علم نہیں ہے شعروشاعری سے دلچسپی نہیں بحر، تقطیع کے نظم وضبط سے واقف نہیں ہوگا تو وہ شاعری کے مافی الضمیر تک نہیں پہنچ سکتا اور اس طرح کا ترجمہ بے حقیقت ہوجائے گا۔ کسی افسانے یا ناول کو ترجمے کی شکل دینی ہے تو ادب کی پوری جانکاری ہونا ضروری ہے۔ ایک مترجم کو ایک ادیب کے حدود کا عرفان ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اپنے ترجمے میں ایک نئی فضا کی تخلیق میں ناکام رہے گا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایک مترجم کو بھی مصنف کی طرح جامع صفات کا ہونا ضروری ہے۔

ترجمہ کے لئے یکسوئی بہت ضروری ہے اور اپنے کام میں غرق بھی رہنا پڑتا ہے ترجمہ کے لئے سب سے اہم چیز مشق ہے یہی ساری باتیں تصنیف کے لئے بھی ضروری ہیں اس طرح ایک مترجم کی حیثیت ایک مصنف سے کم نہیں ہوتی۔

ترجمہ سے زندگی کی صداقتوں کا عرفان ہوتا ہے ہمیں اپنی شخصیت کے سنوارنے میں بھی مدد ملتی ہے دوسری طرف ہم اپنی زبان کو وسعت دیتے ہیں ترجمہ کے لئے اپنی زبان نئے نئے الفاظ اور نئی نئی تراکیب اور مہاورات کا اضافہ کرسکتے ہیں جس سے اظہار و بیان کے نئے طریقے ہمارے ہاتھ آسکتے ہیں ہم اپنی زبان میں نئے نئے خیالات ونظریات کا اضافہ کرسکتے ہیں تہذیب وتمدن کے نئے نئے گوشے دریافت کرسکتے ہیں اس طرح ہماری زبان کی عام سطح بلند ہوسکتی ہے۔

ترجمہ کا فن اس قدر مشکل ہے کہ پوری طرح اس حق کو ادا کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ہم جس زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کررہے ہیں اس زبان مین اس کے لئے بالکل صحیح الفاظ، تراکیب مل سکیں۔ لہٰذا بہت سے موقعوں پر مترجم کو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

بہت سی چیزوں کو مترجم جائز قرار دیتے ہیں اس لئے ترجمہ کے فن کو آگے بڑھانے کے لئے ایسا کرنا ناگریز ہے۔

اس طرح پہلا سمجھوتہ یہ ہے کہ اگر سائنس اور کسی دوسرے علوم میں کسی دوسرے لفظ کا بدل اپنی زبان میں دستیاب نہ ہو تو اس لفظ کو اسی شکل میں اپنا لیا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں کافی چھان بین کر لینا شرط ہے۔ دوسری سہولت یہ ہے کہ دو مرکب الفاظ کا ترجمہ اپنی زبان میں نہ ملنے کی صورت میں اس کو اسی طرح رکھ لینا زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح اگر مرکب الفاظ کے الگ الگ بدل موجود ہیں اور ان کو ملا کر ایک فصیح لفظ بنایا جاسکتا ہے تو اس کے میل سے بنا لیا جاتا ہے جیسے یونیوسٹی کا ترجمہ دارلعلوم، دار اور علوم کے اتصال سے بنتا ہے اور ہاؤس آف کامنز (House of commons) کا ترجمہ دارلعلوم، دار اور علوم کے باہمی ربط سے بنتا ہے لیکن ایسا ٹھیک نہیں ہوتا کہ مرکب الفاظ میں سے ایک لفظ کا ترجمہ کیا اور دوسرے کو اسی طرح رکھ دیا، اس سے بھونڈا اور بے ہنگم ہو جاتا ہے اگر ایسے عمل سے بھی اس کا آہنگ نہیں بگڑتا اور فصاحت مجروع نہیں ہوتی تو جائز ہے اس کام کے لئے ذوق سلیم سے بات کی جاسکتی ہے۔

ترجمہ کے کام میں سب سے بڑی سہولت یہ دی گئی ہے کہ اگر ان مرکب الفاظ کے بدل موجود نہیں ہیں تو ان کو اس طرح اپنا لیا جائے، دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کے بدل موجود نہیں ہیں ان کو اسی طرح اپنا لیا جائے، اس طرح دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے بلکہ ہماری روزانہ کی بول چال میں وہ جس شکل میں استعمال ہوتے ہیں اسے تو اپنا لیا جیسے کلاس، لالٹین، ریل اسٹیشن، اسکول کالج، وغیرہ ترجمہ کی شرط یہ ہے کہ وہ صاف اور سلیس ہو، اس میں الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا نہ ہو۔

ترجمہ کا اصل مقصد کسی تحریر کو اپنی زبان میں ڈھال لینا ہوتا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو ترجمہ ناقص کہا جائیگا۔ اور اگر ترجمہ سے تصنیف کی بنیادی باتوں کو فقط اپنی زبان میں منتقل کر لینا مقصد ہو تو اس کو سرے سے ترجمہ کہنا ہی غلط ہوگا۔ یہ عمل دوسری زبانوں سے چیزوں کے ماخذ کرنے کا عمل ہوا۔ اس لئے کہ ترجمہ، باہم ہم آہنگ ہو جانے کا نام ہے۔

زمانے کے ساتھ ساتھ ترجمے کے فن میں ترقی ہوئی ہے زبان کا معیار بدل جانے کی وجہ سے اس میں کافی انقلاب آیا ہے قدیم تراجم ہم کو غیر دلچسپ اور غلطیوں سے پر نظر آنے لگتے ہیں اسی لئے وقت کے ساتھ ساتھ اہم تصانیف کا بار بار ترجمہ کیا جاتا ہے کبھی اس کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور کبھی تیز، انگیزی زبان میں بھی یہ رفتار کافی سست ہوگئی تھی اس زبان میں بیسویں صدی کے آغاز سے ترجمے کا احیا ہوا ہے اس میں نئے ترجموں کے علاوہ مستند ترجموں کا از سرنو ترجمہ کیا گیا، عصری زبان یا محاورے میں ان کی نئی تعبیریں کی گئیں۔ حد یہ کہ بائبل کے انگریزی ترجمے کا دوبارہ اور عمدہ ترجمہ کیا گیا۔ اردو زبان میں بھی بعض پرانے ترجمے کا نیا ترجمہ ہوا ہے۔

اردو زبان میں ترجمے کا کام برابر ہوتا رہا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس زبان کو نئے خط و خال ترجمے کے ذریعہ ملا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج نے یہ گرانقدر خدمت انجام دی اس سے پہلے اردو نثر نگاری کا کوئی خاص اسلوب نہیں تھا۔ اس کے لئے زیادہ تر فارسی زبان مخصوص تھی۔ دکنی اردو میں جدید نثری کتابیں ضرور ملتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے ترجمہ کے ذریعہ ایک نئے انداز بیان کی بنیاد ڈالی۔ اور ترجمہ نگاری میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا گیا کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ اردو کے ہی ہوں۔ اردو نثر نگاری میں یہ پہلا موڑ تھا کہ شعوری طور پر اردو کو فارسی کی غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی گئی۔

فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کا کام زیادہ تر فارسی زبان کی تصانیف سے کیا گیا۔اس کام کو زیادہ وسیع پیمانے پر دہلی کالج نے انجام دیا اس کالج میں انگریزی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ادبی کتابوں کے ترجموں کے علاوہ یہاں پر علمی اور سائنسی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے جس سے اردو زبان میں علمی مضامین ادا کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی اس سے قبل اس میں داستانی ادب اور قصوں کو بیان کرنے کا ڈھنگ پیدا کیا گیا تھا اس کالج کے ذریعہ اردو زبان میں کچھ دوسرے قسم کے مواد بھی منتقل ہو گئے۔

ترجمے کے سلسلے میں بہت ہی گرانقدر خدمت سائنٹفک سوسائٹی نے بھی انجام دیا ہے۔ اس کا قیام ۱۸۶۲ء میں سرسیدؒ کے ہاتھوں ہوا ہے۔اس کی غائت یہ تھی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے مغربی ادب وعلوم کا مذاق ہندوستانیوں میں پیدا کیا جائے اس سوسائٹی نے تقریباً ۴۰ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔اب اردو زبان خود کفیل ہو چکی تھی۔اپنی سرچشمہ زبانوں سے الگ ہو کر اپنی بالیدگی جاری رکھ سکتی تھی ''تہذیب الاخلاق'' اور اسٹیوٹ گزٹ نے اس کام کو تادیر قائم رکھا۔اس طرح اردو زبان میں ترجمے کا سلسلہ ۱۸۰۰ء سے مسلسل جاری ہے اتنا ضروری ہے کہ اس کام کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہی ہے اس زبان میں ابتدا ہی سے فارسی عربی تحریروں کے ترجمے شروع ہو گئے تھے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا ہر زبان نے اپنی ابتدا اخذ، اور ترجمے سے کی ہے۔اکتساب، اخذ ترجمہ بری چیز نہیں ہے۔یہی بعد میں تخلیقی صلاحیت میں بدل جاتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنا ادبی سفر ترجمے سے ہی شروع کیا۔دہلی کالج سے تو وہ براہ راست وابستہ رہے نو سال طالب علم رہے اپنی ملازمت کی شروعات بھی وہیں سے کی لیکن یہ بھی

سچ ہے وہ ترجمہ کی مجلس سے وابستہ نہیں رہے اس کی خاص وجہ یہ تھی کی وہ انگریزی کے طالب علم نہیں تھے ان کے برعکس مولوی ذکاءاللہ کا نام مجلس ترجمہ کے سرگرم ممبروں میں آتا ہے کیونکہ وہ انگریزی کے ایک اچھے طالب علم تھے مولوی ذکاءاللہ نے ترجمہ کا کام زیادہ کیا ہے۔لیکن اس کام کا اثر ان کی شخصیت پر ایک مترجم کی حیثیت سے ہوا اور آخر دم تک مترجم ہی رہ گئے لیکن پھر بھی نذیر احمد کے لئے اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ وہ ترجمہ کا شوق لیکر دہلی کالج سے ہی نکلے تھے۔

سیدہ جعفر کی ایک تحریر سے اشارہ ملتا ہے کہ نذیر احمد نے سب سے پہلے ماسٹر ران چندر کی ایک انگیریزی کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا ہے وہ کہتی ہیں:

> ''چنانچہ نذیر احمد رام چندر کی خاطر ان کی فرمائش پر اس انگریزی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ کیا تھا رام چندر اسلام کی تردید میں لکھ رہے تھے۔اس پر دلی والوں نے بڑا شور مچایا تھا۔یہاں تک کہ مولوی عبدالقادر، نذیر احمد کے لئے کفر کا فتوی لائے تھے۔''

لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ماسٹر رام چندر کی یہ تصنیف بعد کی ہے، گارسن وتاسی کا قول ہے:

> ''اعتراض القرآن، میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے، شورش عظیم سے قبل رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔''

ویسے نذیر احمد نے باقاعدہ طور پر ترجمے کا کام اپنی ملازمت کے سلسلے میں ہی کئے ہیں دوران ملازمت ہی انھوں نے انگریزی زبان سیکھی غالباً ۱۸۵۸ء میں جب وہ آلہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ یہ کمی تو انھیں طالب علم کے دور سے کھٹکتی تھی لیکن اس کی تلافی کے لئے

دوران قیام الہ آباد متوجہ ہوئے اور انگریزی سیکھنے کا ان کو جنون ہو گیا۔ اس جنون کی بھی ایک وجہ تھی ان کے ایک ماتحت نے ان کے سامنے انگریزی کا ایک کاغذ تفوق کے جذبے کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔ اس کے اس قسم کے خدمات سے انھیں شدید صدمہ پہنچا اور اپنی نا اہلی پر افسوس ہوا۔ اس واقعہ سے ان کی انگیریزی سیکھنے کی حواہت اور بڑھ گئی چنانچہ اپنی ایک تقریر میں انگریزی سیکھنے کے واقع کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''الہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرا یا بیٹھک میری ان کی مشترک تھی، ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اردو کی شد بد کے علاوہ مشن اسکول میں انگیریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کر کے کسی قدر کھٹکا مگر دیکھا تو ان کو پکا مسلمان پایا۔''

سب سے پہلے جس شخص نے انگریزی دانی کی طرف میرے سوئے مظنّہ کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔...... غرض میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی مگر مشکل یہ کہ میری نوکری تھی دورے کی، تو میں کیا کرتا، اسال ٹائپ کی (Type Small) عربین نائٹس (Arbian Night) دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ سے دیکھ لینا اور دورے میں ان کو رٹا کرتا شروع شروع میں انگریزی ہجوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار ذہن نشین ہو گئے تو میں انگلش انٹو اردو ڈکشنری (English into urdu dictinary) کی مدد سے آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا، یہ صرف چھ مہینے ہیں''۔

نذیر احمد اپنی انگریزی لیاقت کے متعلق ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اور اب بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی کرتا ہوں، زیادہ نہیں ہو سکتا تو با الالتزام انگریزی اخبار پڑھتا ہوں، غرض میں نے انگریزی ٹوٹی پھوٹی کرلی، مگر از

بس کہ انگریزی کا رروائی کرنے کا موقع نہیں ملا میں اس کو امپرو
(Improve) نہ کر سکا۔ انگلش امپرو کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ انگلش لائف
یا انگلش وائف سو اس کے لئے خدا نے مجھے پیدا نہیں کیا پر میں بی۔ اے
والوں سے پالا لینے کو موجود ہوں مگر بی۔ اے بھی مسلمان۔" [1]

نذیر احمد نے بعد میں عربی زبان کی مدد سے انگریزی زبان کی قواعد بھی خود ہی بنالی تھی، کیونکہ انگریزی کی قواعد سے ان کی واقفیت بہت معمولی تھی۔

ترجمہ کے کام میں سب سے بڑھ کر الفاظ کے متعلق گہری واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نذیر احمد الفاظ کے پارکھ تھے وہ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ انگریزی الفاظ کو اپنے تخیل اور اس کے محل استعمال سے مکمل طور پر سمجھ کر وہ اردو اور اس کی سرچشمہ زبانوں سے بآسانی اس کے ہم معنی الفاظ تلاش کر لیتے تھے کیونکہ حافظہ تیز، شعور پختہ، تخیل بلند اور باریک ہیں اور ساتھ ہی ایک تنقیدی صلاحیت یہ تمام ان کے قبضۂ قدرت میں تھیں ان کی تنقیدی صلاحیت ان کی تقریروں اور تحریروں میں اکثر جگہوں پر ظاہر ہوئی ہے۔ اپنے لکچروں میں برابر وہ اپنے ہم عصروں کی امتیازی حیثیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے متعلق نذیر احمد کی رائیں آج بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ وہ منشی ذکاء اللہ کو ریاضی داں، علامہ شبلی نعمانی کو مورخ، حالی کو شاعر کہتے ہیں۔ آج بھی ان لوگوں کے ساتھ کم و بیش یہی تمام چیزیں خاص طور پر وابستہ کی جاتی ہیں۔ غالب کی شعری صلاحیتوں کا ان کے اشعار کو بار بار نقل کر کے اعتراف ان کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کی غماز ہیں غالب کے ساتھ وہ جدت ندرت جیسی خوبی کو خصوصیت کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ نذیر احمد خود بھی ہر جگہ انھیں خوبیوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب،

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد اول ص ۲۴۳

تحریر کا اچھوتا پن اوران کی اختراع کی بازگشت اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ایشیائی خاص کر فارسی ادب وشعر سے ان کی بے اعتنائی ان کے بدلے ہوئے شعور کا پتہ دیتی ہے۔نذیر احمد کے اندر قوت نقد کی روح اور قوت فیصلہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھی ان کی استواری بھی ان کو شاہراہ سے کامیاب گذرنے میں کم مد نہیں کرتی۔قوت فیصلہ،خود اعتمادی،شعور نقد، استواری اورادب وشعر کا اعلیٰ مذاق اور مختلف علوم سے واقفیت ایک مترجم کے لئے ضروری خصوصیات ہیں ان تمام چیزوں کا پتہ نذیر احمد کی شخصیت میں چلتا ہے۔اس لئے ان کے ترجمے مستقل اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن ان کا پورا فائدہ ترجمہ القرآن کو پہنچا۔

نذیر احمد نے سب سے پہلے انگریزی کی ایک قانون کی کتاب ''انکم ٹیکس ایکٹ'' کا ترجمہ کیا انکم ٹیکس ایکٹ اول بار جاری ہوا تھا۔سر ولیم میور جوان دنوں سنیئر ممبر آف رونیو بورڈ تھے اس ایکٹ کا اردو ترجمہ کرانا چاہتے تھے اس کے لئے انھوں نے ناصر علی خاں ذوالقدر ڈپٹی کلکٹر اول کی خدمات طلب کیں لیکن انھوں نے اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کرنے کے ساتھ ہی نذیر احمد کا نام پیش کر دیا۔

نذیر احمد نے بھی اس وادی میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا اس لئے ان کی ہمت ہی اس کام کو ہاتھ لگانے کی نہیں ہوتی تھی۔لیکن ڈپٹی صاحب کے ہمت بڑھانے پر وہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے اور بحسن وخوبی اس کو انجام بھی دیا۔اس ترجمہ سے لارڈ میور صاحب پر بہت ہی عمدہ اثر پڑا۔ترجمہ کی وادی میں وہ یہیں سے داخل ہوئے اس کے بعد مسٹر لو سے مانگ کر بورڈ کے کئی سر کلر کا ترجمہ اپنے شوق سے کیا۔

نذیر احمد کا پہلا اہم ترجمہ ہے، ترجمہ پینل کوڈ، یہ ایک اہم قانون کتاب ہے اس میں

انگریزی سے اردو ترجمہ اور اصطلاح سازی دونوں کے لئے ملکہ کی ضرورت تھی، یہ کام بہت ہی نازک تھا قانونی کتابوں کے ترجمے کے لئے قوت فیصلہ، استواری، عمد گہری اور عمدہ سوجھ بوجھ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انھیں ترجموں پر کتنی بیش بہا زندگیوں کا انحصار ہوتا ہے، ذرا سے غلط ترجمے سے قانونی دفعات یکسر بدل کر اس ضد بھی ہو سکتے ہیں اس لئے اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں، کہ قانونی ترجمہ کس قدر اہم ہوتا ہے۔

پینل کوڈ ترجمے کی اہمیت تو اور بھی محتاج ثبوت نہیں پھر بھی یہاں اتنا کہہ دینا اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''تعزیرات ہند'' کا کام معمولی آدمیوں کے زیر نگرانی رکھا بھی نہیں گیا تھا بلکہ براہِ راست لفٹنٹ گورنر مقارن سر جارج ایڈ جسٹن اس کے نگراں تھے، جو ریڈ صاحب ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی ترجمہ کی تصیح کے بعد بھی اپنی آخری نظر ڈال لیتے تھے۔

پینل کوڈ کے ترجمے کا کام اس طرح انجام پاتا کہ منشی عظمت اللہ اس کا ترجمہ کرتے تھے پھر کریم بخشی اس پر نظر ثانی کر لیتے تھے اور اس کے بعد ریڈ صاحب اس کی تصیح کرتے اور گورنر صاحب اس پر آخری نظر کرتے تب کہیں جا کر ترجمہ بالکل ٹھیک سمجھا جاتا، ترجمہ کا کام بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا جلد بازی سے اس کے غلط ہونے کا اندیشہ تھا۔

انکم ٹیکس ایکٹ ترجمہ سے نذیر احمد کا ڈھڑ کا کھل چکا تھا۔ کچھ لوگ انھیں مترجم کی حیثیت سے جاننے لگے تھے لیکن اپنے افسروں کی نظر میں مشق کی کمی کی وجہ سے ابھی ''تعزیرات ہند'' کے ترجمے کی اہلیت ان کے اندر نہیں تھی اور نذیر احمد اس کام میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

نذیر احمد جس وقت الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اس زمانے میں لفٹنٹ گورنر الہ آباد دورے پر آنے والے تھے اور کمشنر کے یہاں ٹھہرنے کا پروگرام تھا نذیر احمد کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ پینل کوڈ کا ترجمہ ریڈ صاحب کو سنا دیا کریں۔ ریڈ صاحب پر اس کا بہت ہی اچھا اثر ہوا اور انھوں نے ایک چھٹی لکھ کر نذیر احمد کے حوالے کیا کہ آج ہی ڈاک میں بنارس پہنچ کر یہ چھٹی لاٹ صاحب کو دے دو وہ تم کو ترجمہ میں شریک کرلیں گے۔ اس طرح نذیر احمد ترجمہ کمیٹی میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد تین آدمیوں نے پینل کوڈ کے ترجمے کو مکمل کیا۔ اس کے صلے میں ان لوگوں کو پانچ چھ سو روپے کی گھڑی انعام میں ملی اور تینوں کو ڈپٹی کلکٹر کے لئے نامزد کیا گیا۔

پینل کوڈ ترجمے کے متعلق رام بابو سکسینہ اردو ادب کی تاریخ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> ''مجموعہ تعزیرات ہند'' یعنی پینل کوڈ کے ترجمہ کو ان کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیے، اس مشہور قانون کے ترجمے کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم میور لفٹینٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لئے مقرر ہوئے تھے اور انھوں نے بڑی محنت، جانفشانی اور قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔'' [1]

اس تحریر سے یہ بات واضح ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے عہدۂ لفٹنٹ کے زمانے میں نذیر احمد کو اس ترجمے پر نظر ثانی کے لئے مقرر کیا تھا۔ کیونکہ بقول نذیر احمد ترجمہ کا کام ایڈمسٹن نے کرایا تھا، نہری اسٹوارٹ ریڈ اس وقت ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے اور لارڈ میور سنیئر

---

[1] اردو ادب کی تاریخ حصہ نثر ص ۵۷

ممبر آف رونیو بورڈ تھے۔

افتخار احمد صدیقی پینل کوڈ کے ترجمے کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''پہلے انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ کیا۔ پھر انڈین پینل کوڈ ''تعزیرات ہند'' کے ترجمے میں شریک ہوئے۔ لیکن اس لحاظ سے شریک غالب رہے کہ پورے ترجمے کی اصطلاح اور نظر ثانی کا کام بھی انجام دیا۔'' [1]

نذیر احمد خود بھی اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں:

''مطلب کی بات تو یہ ہے کہ جب ہماری ٹیرنیٹی (تثلیث) کو لاٹ صاحب نے ڈپٹی کلکٹر یاں دینی تجویز کیں۔ ریڈ صاحب نے نومینشن (Nomination) اول کے فارم پر میری انگریزی دانی کی بہت ہی مدح کی۔'' [2]

ان تمام بیانات سے ''مجموعہ تعزیرات ہند'' کی تیاری میں ان کے حصے کا تعین آسان ہو جاتا ہے اس کام میں حیثیت انفرادیت کی حامل ہے۔ اور اس کو ان کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے حکومت نے بھی ان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اور اس دور کی سب سے اعلیٰ ملازمت جو ایک ہندوستانی کے لئے تھی، عطا کی، اس اعتبار سے بھی کہ نزیر احمد کی وضع کی ہوئی اصلطلاحیں آج بھی ہندوستانی عدالتوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

انڈین پینل کوڈ کے متعلق وحید الدین سلیم لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کی اصل قابلیت کے جوہر اس وقت ظاہر ہونا شروع ہوئے

---

[1] فسانۂ مبتلاء مجلس ترقی ادب لاہور ص ۵۰-۵۱

[2] لکچروں کا مجموعہ جلد اول ص ۴۳۸

جب آپ کے سر تعزیرات ہند، اور ضابطہ فوجداری کا کام دیا گیا جن لوگوں
نے انگریزی اصل اور اس کے ترجمے کو بالمقابل رکھ کر غور کیا ہوگا وہ بخوبی اس
کا اندازہ کریں گے کہ مولانا کی علمی قابلیت اسی زمانے میں کس پایہ تک پہنچی
ہوئی تھی۔'' [1]

اس ترجمے کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرحت اللہ بیگ بھی تحریر فرماتے ہیں:

''تعزیرات ہند کا ترجمہ دیکھو وہی لفظ، معنی بھی پورے دیتا ہے اور
اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا سیکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے اور دوسری
اشاعت میں کچھ اور تیسری اشاعت میں کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا
ترجمہ بھی ایک کارنامہ ہے۔'' [2]

نذیر احمد نے اصطلاحات کو وضع کرنے میں عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی زبان سے بھی مدد لی ہے۔ ترکی زبان کے الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ترک سپاہی مغلیہ فوج میں تھے دوسرے کچھ ترک ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادیبوں نے بھی ترکی کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں داخل کئے اس کے علاوہ مسلمانوں کو ترکی سے ایک قسم کا انس بھی رہا ہے ترکی زبان کے بعض الفاظ اپنی شکل تبدیل کر کے اردو میں استعمال ہو رہے ہیں ''جیسے بیگم'' ترکی کے لفظ ''بیکم'' سے بنا ہے۔ نذیر احمد بھی اپنے ترجمے میں اس زبان سے الفاظ لیے ہیں۔

پینل کوڈ کے چند اصطلاحی الفاظ کا اردو ترجمہ نذیر احمد نے اردو کے حسب ذیل الفاظ سے کیا ہے۔ آتش گیر اشیا (Inflammble)، اثبات جرم سابق، اجر جائز، ازالہ حیثیت عرفی،

---

[1] مضامین سلیم جلد دوم ص ۱۵۷

[2] مضامین فرحت حصہ دوم ص ۵۰

استحصال بالجبر، استحصال بجا، آسودگیٔ عامۂ خلائق، آئین جنگی، بے ٹھیا کئے ہوئے ٹکڑے تابنے، بے نا کام مکاتبہ، تبادل، تحقیر اختیار جائز، ترکی کی راہ عام، تصرف بیجائے مجرمانہ، ثبوت جرم سابق، جبر مجرمانہ، جبری محنت، حبس دوام، عبور دریائے شور، حفاظت خود اختیاری، خطرناک حربے، سیاہانہ لباس، سدیش یعنی فساد انگیزی، سرقہ بالجبر کرنے والا طبقات رعایا، عافیت ذاتی، قانون مختص الامر، مسئلہ سزا، کفالت المال، مجرائے آب، مجمع خلاف قانون، مستثنیات عامہ، مشترک افعال، وجہ ثبوت، مرکب تری، معاہدہ کا نقص مجرمانہ اور نشان صرفہ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام اصطلاحیں قانونی ادب کا جز ولاینفک ہوگئی ہیں۔ اصطلاحیں زیادہ تر عام فہم زبان میں ڈھالی گئی ہیں۔ ان کو مختصر بنانے کی بھی شعوری طور پر کوشش ملتی ہیں۔ بدرجۂ مجبوری اس کے مطلب کو ادا کرنے کے لئے اردو کے کئی لفظوں سے کام لیا گیا ہے۔ سب سے بنیادی کوشش اس بات کی گئی ہے کہ اصطلاحات واضح ہوں اور ٹھیک ٹھیک انگریزی لفظ کا ہی مفہوم ادا کریں۔

اس کے بعد نذیر احمد نے ضابطۂ فوجداری کے ایک ترجمے کو درست کیا اور اس کو بھی عمدہ شکل دینے کی کوشش کی یہ ترجمہ بھی کافی اہم خیال کیا جاتا ہے یہ ترجمہ ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا وہ اس وقت کانپور میں تحصیل دار تھے۔ اور تعزیرات ہند کا ترجمہ ۱۹۶۱ء میں ہوا تھا۔ ضابطہ فوجداری کے اس ترجمے کے بعد ان کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔

جس زمانے میں وہ گورکھ پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے اپنے ایک ملاقاتی میوروں صاحب کے لئے انھوں نے قانون شہادت کے ایک متن کا ترجمہ کیا جو بہت ہی کامیاب ہوا۔ میوروں صاحب مہتمم بندوبست تھے حالانکہ نذیر احمد ان کے ماتحت نہیں تھے مگر ان کی فرمائش پر اس کام کے لئے تیار ہو گئے اور بخیر وخوبی انجام دیا۔ لیبورون صاحب اس کو نول کشور صاحب کے مطبع سے شائع کرایا۔

اعظم گڈھ کے قیام کے دوران انھوں نے ایک اور بہت ہی اہم ترجمہ کیا جو سماوات کے نام سے مشہور اہوا۔ نذیر احمد کے اس ترجمے کی اہمیت قانونی ترجموں سے الگ نوعیت کی ہے یہ ایک علمی ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کو دیکھنے کے بعد نذیر احمد کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے حیات النذیر سے اس کے کچھ نمونے دیئے جاتے ہیں:

''بھلا اگر تم سے کوئی سوالات پوچھ بیٹھے۔

۱- یہ جو ظاہر میں ایک سمندر سا امنڈا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کنارے کے نام ونشان، اس کی تھا کا پتہ ٹھکانہ، تم بتاؤ کدھر ہے دکھاؤ کہاں ہے۔

۲- وہ تو کچھ عقل انسانی کے لئے ایک شرف مقدر تھا کہ سب علوم میں پہلے علم ہیاۃ ایجاد ہوگیا، ورنہ یہ وہ چوٹی کے مسئلے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں ایجاد کا مادہ کتنا ہی کیوں نہ ہوبے مدد علم ہیاۃ ان کو حل کرنے کا ارادہ کیا وہ سری۔''

نذیر احمد نے اس جملے میں اس قدر جدت پسندی سے کام لیا ہے کہ اس پر اصل تصنیف کا گمان ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ انھوں نے اس ترجمے میں اشعار بھی نقل کئے ہیں جو یقیناً اصل تصنیف میں نہیں ہوں گے ویسے تو لسانی ردوبدل ہر مترجم کے لئے ایک ناگریز صورت ہوتی ہے یقیناً نذیر احمد نے بھی ترجمے کے اندر لسانی خوبی وجدت پسندی کے پیش نظر کچھ نہ کچھ تبدیلیاں کی ہوں گی جو ترجمہ کے فن کے لئے کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس ترجمے کے لئے نذیر احمد کو علمی اصطلاحات وضع کرنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے ہیں اس ترجمے کی اصطلاحیں بھی نذیر احمد کی زبان کی پختگی، استواری اور اہلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں ان کی چند اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں:

''سلطان خاور، نقاط روشن، عالم تاریکی، قدرتی چراغ، کرات معلقہ،

قوت نظری، فراضی عالم، پیچ دار حرکتوں، جہاں مرئی، اجرام فلکی، آیات
آسمانی، معتدل موکم کہکشاں، نظام شمشی، رصدگاہ، مجموع عالم وغیرہ وغیرہ۔"

اس طرح ان اصطلاحوں کی وجہ سے نذیر احمد کی زبان دانی، جدت پسندی، اور جستجو کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس ترجمے سے ہماری زبان میں کافی نئے الفاظ داخل ہو گئے۔ زبان کی کافی ترقی ہوئی۔ چونکہ نذیر احمد نے اس ترجمے سے اردو زبان میں بہت سے نئے الفاظ کا اضافہ کیا اور علمی مضامین کے بیان کی صلاحیت بڑھایا۔ اس حیثیت سے نذیر احمد کا یہ کارنامہ بہت ہی گرانقدر ہے افسوس! سموات کا ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔

علمی اور قانونی تصانیف کے علاوہ نذیر احمد نے افسانوی نصنیفوں کا ترجمہ بھی کیا جس کا جائزہ اس اعتبار سے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس سے اردو زبان کو واقعات بیان کرنے کے جدید طریقے ہاتھ آئے۔

نذیر احمد نے غالبؔ کے خطوط، باغ و بہار جیسی تصانیف سے اثر تو لیا ہی ہے اس کے علاوہ سماج و معاشرت سے بھی اپنی زبان کی تشکیل میں مدد لی ہے۔ دہلی کے علاوہ یوپی کے بہت سے علاقوں میں رہ چکے تھے اور اپنے کام کے سلسلے میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں سے گفتگو کا موقع ملتا تھا۔ صدر آباد کی ملازمت کے دوران تلگو وغیرہ کی واقفیت سے ان کی زبان اور بھی مالا مال ہوگئی۔ اعظم گڈھ کے تو بہت سے الفاظ ان کے ناموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ملازمت کے سلسلے بہت سی جگہوں پر جانا پڑا جس کی وجہ سے ان کو ملک کے وسیع حصے کے عوام کی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے تراجم زبان کے اعتبار سے اور لفظوں کو برمحل استعمال

کرنے کے لحاظ سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے ترجموں میں سب سے اہم تصنیف ''مصائب غدر'' ہے اس کے متعلق رام بابو سکسینہ نے اردو ادب کی تاریخ میں لکھا ہے:

''فسانۂ غدر (مصائب غدر) ایڈورڈ صاحب کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے۔''

اپنی افسانوی تحریروں میں عورتوں کی زبان کو براہِ راست اخذ کیا ہے۔ ان کو دہلی میں عورتوں سے نزدیک رہنے کا بچپن سے اتفاق حاصل تھا۔ شاہی کے قلعہ معلّٰی کی بیگمات سے بھی ان کا گہرا ربط قائم ہو گیا تھا مصنف حیات النذیر نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالقادر صاحب کی طبیعت کبھی نادرست ہوتی تو اس جگہ ہمارے مولانا کو بھیج دیتے، یوں چند بیگموں اور شاہزاروں سے مولانا کی بھی شناسائی ہوگئی تھی، بیگموں میں محمدی بیگم اور فخر الملک ولی عہد کی دوسری بیگم اور خود بادشاہ کی بیگم نواب تاج محل کے ساتھ ایک خاص خصوصیت تھی، نواب تاج محل نے مولانا سے مثنوی ''نل ودمن'' کا ایک حصہ پڑھا بھی تھا، محمدی بیگم مولوی عبدالقادر کو باپ اور مولانا کی بیوی کو خلیفہ کہا کرتی تھیں۔'' [1]

نذیر احمد کی منتخب الحکایات'' بھی زیادہ تر انگریزی حکایتوں کا ترجمہ ہے یہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اس کی زبان سادہ ہے کہیں کہیں مشکل الفاظ قصداً لائے گئے ہیں تاکہ بچے اردو کچھ مشکل الفاظ سے بھی روشناسی ہو جائیں۔ اس کو بھی نذیر احمد کے افسانوی ترجمہ میں شمار کر سکتے ہیں مگر نذیر احمد نے اس میں طنز سے زیادہ مزاح کا سہارا لیا ہے اس میں الفاظ لانے کی کوشش لی گئی ہے جس سے بچوں کو اور اس کے ساتھ ان کے والدین کو بھی ہنسنے کے مواقع نصیب

---

[1] حیات النذیر ص ۳۹-۴۰

ہوتے ہیں اور گھر میں اس کے مطالعہ سے ایک خوشگوار ماحول بنا رہے ظاہری سی بات ہے کہ اتنے زبردست نصب العین کے لئے زبان کا پختہ ہونا اور لسانی و ادبی قوانین کا علم ہونا انتہائی ضروری ہوجاتا ہے تاکہ ترجمہ غیر معیاری اور غیر ادبی نہ ہوجائے اور یہی ادب کی جدت ہے۔ [1]

حیدر آباد کی ملازمت کے دوران انھوں نے سات آٹھ چھوٹی کتابیں اور رسائل تحریر کئے تھے جن کے اندر اعمال کے لئے ہدایتیں اور شہزادے لائق علی کے لیے جو کہ بعد میں حیدر آباد حکومت کے سربراہ بنے تعلیمی نصاب تھا اس کو نذیر احمد نے بڑی جانفشانی سے تیار کیا تھا سر سالار جنگ اول نے اس کو اتنا پسند کیا کہ آئندہ پنشن میں ڈیڑھ سو روپئے ماہوار کا اضافہ کیا گیا اور انھوں نے خود بھی اس کو بڑے انہماک سے پڑھا۔ کچھ سیاسی مصلحتوں کی بنائ پر ان رسالوں کی چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے علاوہ لکچروں میں استعمال کئے گئے انگریزی اصطلاحی الفاظ کے ترجمے جو انھیں کے سامنے قوسین میں دیئے ہوئے ہیں اگر انھیں کے کئے ہوئے ہیں تو یہ ترجمہ شدہ الفاظ ان کی اس صلاحیت کی انتہا کہے جاسکتے ہیں اور تعزیرات ہند کی اصطلاحوں سے زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ان صلاحیتوں کی ترقی پذیری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

نذیر احمد کی دو مذہبی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک ترجمۂ قرآن دوسری الحقوق والفرائض امہات الامہ بھی ان کی ایک اہم مذہبی تصنیف مانی جاتی ہے اس کے علاوہ اجتہاد، مطالب القرآن، ادعیۃ القرآن، سورۃ وغیرہ بھی ان کی چھوٹی بڑی کئ مذہبی کتابیں ہیں لیکن یہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) ص ۱۰۰۳ اشفاق اعظمی

اکثر ادیب ترجمہ کو نذیر احمد کا سب کارنامہ مانتے ہیں اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اس ترجمہ کے کام میں طبع زاد ناولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت اور کوشش سے کام لیا ہے اس کام میں وہ تین سال تک لگا تار لگے رہے اس میں رات و دن ایک کر دیا۔ اور اپنے ترجمے کے سلسلے میں انھوں نے بہت ہی واضح بات کہی ہے کہ بغیر عربی زبان سے واقفیت کے کوئی ترجمے سے اس کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا سب کچھ سمجھ لے لیکن اس کے معجزہ کو کیسے سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو کفر و الحاد کے راستے سے نکال کر پھر دوبارہ اسلام کے راستے پر ڈالا، اسی لئے وہ اپنی قوم کو برابر تاکید کرتے ہیں کہ وہ عربی زبان کو سکھیں وہ اس زبان کو شرط مسلمانی کہتے ہیں اور شعار قومی بھی بتاتے ہیں لیکن قوم کی اس زبان کی طرف سے لاپروائی سے وہ مایوس تھے ان کی اسی مایوسی کے بطن سے قرآن شریف کے ترجمے کا خیال جنم لیتا ہے۔

مختلف شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کا کام ۱۸۹۳ء میں شروع ہوا اور ڈھائی تین سال کی شب و روز کاوش اور محنت شاقہ سے ۱۸۹۵ء کے اواخر میں مکمل ہوا اور پہلی بار ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کام میں ابتدا تا ختم بہت محتاط رہے ایک مذہبی جذبہ بھی اس کے ساتھ منسلک تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک جذبہ اور بھی تھا کہ ان کا اپنا انداز بیان بھی خراب نہ ہو اس طرح ان کے سامنے ایک طرف تو قرآن کی عظمت تھی دوسری جانب زبان کا خیال، انھیں دونوں خیالوں کے درمیان اس ترجمے کی تکمیل عمل میں آئی۔

ڈپٹی نذیر احمد سے پہلے بہت سے قرآن کے ترجمے ہو چکے تھے جو دنیا کے مختلف زبانوں عربی و فارسی اور دیگر زبانوں میں تھے نذیر احمد نے بھی قرآن کے ترجموں کا جوان سے پہلے کئے گئے تفصیلی جائزہ لیا ہے اپنے ایک لکچر میں تراجم قرآنی کے متعلق حسب ذیل انداز میں رقم طراز ہیں:

''بہر کیف قرآن کے متعدد ترجمے موجود ہیں مگر سب سے مشہور مقبول تین ہیں اور کتنے بڑے دینی فخر کی بات ہے کہ تینوں ترجمے ایک ہی گھر کے ہیں اسلام کے اعتبار سے جو خاندان عموماً تمام ہندوستان اور خصوصا دہلی موجب فخر رہا ہے۔ اس کے مورث اعلی تھے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ان کے دو فرزند مولانا شاہ ولی اللہ اور مولانا شاہ اہل اللہ صاحب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے چار فرزند تھے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب، اور مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے والد مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، فارسی ترجمہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے، بڑی احتیاط سے ترجمہ کیا ہے۔ احادیث و تفاسیر پر شاہ صاحب کی بڑی وسیع نظر ہے اور اس لئے یہ ترجمہ سب سے زیادہ مستند ہے مگر ہے فارسی اور ظاہر ہے کہ اگر شاہ راہ عدم پر آگے عربی ہے تو پیچھے فارسی اردو کے دو ترجمے ان میں سے ایک مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کا اور دوسرا مولوی شاہ عبدالقادر صاحب کا مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ لفظی ہے جس کو انگریزی لٹرل کہتے ہیں یعنی رفیع الدین صاحب ترتیب الفاظ کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔'' [1]

اس کے بعد نذیر احمد نے اپنی بات کو مثال کے ذریعہ واضح کی ہے لٹرل اور فصیح ترجمے کے فرق کو واضح کیا ہے اس کے بعد ترجمے کے قاعدے پر روشنی ڈالی ہے اور شاہ رفیع الدین کے ترجمے پر تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''اور جملہ صرف فعل فاعل مفعول کا نام تو نہیں، بعض اوقات شرط و جزا اور متعلقات، بدل اور تاکید اور صفات اور معطوفات اور جملۂ معترضہ وغیرہ

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص ۲۵-۲۶

کے داخل کلام ہونے سے ایک جملہ کئی کئی سطروں میں جا کر تمام ہوتا ہے اور
جب تین لفظوں میں ترتیب کی پابندی کرنے سے اردو کا یہ حال ہو گیا کہ زید
نے عمرو کو مارا کی جگہ، مارا زید نے عمرو کو بولنے لگے تو ان بڑے جملوں کا کیا
حال ہوتا ہے جن کے ساتھ متعلقات کا ملبادم چھلا بھی لگا ہے۔ بس یہ حال
ہوتا ہے کہ عبارت اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے، طبیعت الجھتی ہے ہماری
اپنی زبان ہے اور مطلب بھی دقیق نہیں مگر ایسی تعقیدات واقع ہوئی ہیں کہ
قدم قدم پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔'' [1]

اس طرح نذیر احمد نے ان لکچروں میں قرآن کے ترجمہ کے فن اور اس کے قدیم ترجموں پر کافی بحث کی اور آخر میں شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے متعلق لکھا ہے کہ ''شاہ رفیع الدین کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادر نے اس کی پیچ کو ڈھیلا کیا ہے مگر انقباض ان کے ترجمے بھی ہے۔'' [2]

جبکہ نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کی دیکھ بھال اور تصحیح کے لئے وقت کے ایک باکمال عالم ترجمہ میں نذیر احمد کے شریک بلکہ انھیں کے بقول شریک غالب تھے کافی بحث ومباحثہ کے بعد کسی نتیجے پر پہونچے تھے، اس طرح ترجمہ تیار ہوا تو فتح محمد خاں جالندھری نے بھرپور ترجمے پر نظر ثانی کی اور کافی سخت تنقیدی نظر سے دیکھا وغیرہ بہتر ہے کہ اس واقعہ کو انھیں کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے ان کو لکھا کہ ارادت مندانہ نہیں بلکہ مخاصمانہ اور معترضانہ
نظر سے دیکھیں اور انھوں نے اپنی نظر سے دیکھا اور تمام تر دیکھا اور خوب
دیکھا اس وقت ہم نے ترجمے کی عبارت کی خوبی کے پیچھے اصل مطلب کا تو
نہیں مگر ترتیب الفاظ کا اور خود الفاظ کا جس قدر خیال کرنا ممکن تھا نہیں کیا تھا

---

[1] لکچروں کا مجموعہ ص-۲۶
[2] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص-۲۹

> مولوی فتح خاں نے ہم کو روکا اور بجا روکا اور ہم نے سارے ترجمے کو تیسری بار دیکھا اس وقت تک ہمارہ ترجمہ بطور ایک کتاب کے علیحدہ لکھا ہوا تھا اب کاپی لکھنے کی نوبت آئی تو جہاں جہاں چک و اصلاح کی وجہ سے زیادہ مشکوک ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب نے کاتب کے لئے نقل کیا، نقل کرتے وقت جو اشتبہات واقع ہوتے وہ ان کو میرے روبرو پیش کرتے اور یہ چوتھی نظر ہوتی مگر۔'' [1]

نذیر احمد نے قرآن مجید کا ترجمہ بہت ہی محنت اور تندہی سے کیا ہے۔ نذیر احمد کو قرآن مجید کے ترجمہ سے نہ تو شہرت کی غرض تھی اور نہ مالی منفعت ہی درکار تھی اور نہ ہی ثواب دارین کا جذبہ ہی ان میں کارفرما تھا بلکہ اس سے ان کی بس اتنی غرض تھی کہ قوم کو قرآن فہمی کا ایک جامع وسیلہ میسر آجائے اور وہ اصل اسلام یعنی اس کی روح کو سمجھ سکے اور دینوی اور دنیاوی ترقی اور فارغ البالی حاصل کر سکے نزیر احمد نے اتنی زیادہ محنت نہ تو اپنے کسی دوسرے کام میں کیا اور نہ وہ کسی دوسرے کام کے لیے اس قدر موزوں ہی تھے۔

نذیر احمد کے ''ترجمہ قرآن'' کا جائزہ ''تراجم القرآن'' نے بہت ہی گہرائی سے لیا ہے۔ ''تراجم القرآن'' کو اس جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ قرآن کے ترجمے میں ڈپٹی نذیر احمد نے کس قدر جدت پسندی سے کام لیا ہے ''تراجم القرآنی'' کا جائزہ ملاحظہ ہو:

> ''زبان کی سلاست، شستگی اور شگفتگی کے لحاظ سے اس ترجمہ کو بڑی شہرت حاصل ہے ڈپٹی نذیر احمد کا شمار اردو ادب کی تاریخ میں ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اردو ادب کی تعمیر میں برابر کے شریک ہیں۔ لیکن ڈپٹی

---

[1] بحوالہ حیات النذیر ص-۳۵۰

صاحب کی زبان انشاء میں ایک خاص نقص ہے جس نے ان کی بعض تصانیف کو علمی معیار پر سبک کر دیا ہے۔ وہ انشاء میں حسن بیان بیدار کرنے کے لئے جا بجا بکثرت محاورے استعمال کرتے ہیں جو اکثر فرق مراتب اور حد احترام سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ڈپٹی صاحب کی علمی تصانیف اس پر شاہد ہیں اس نقص سے قطع نظر جیسا کہ ابتداً عرض کیا گیا ہے، ترجمہ بلحاظ زبان و انشاء نہایت سلیس، شستہ اور ادیبانہ ہے البتہ متن کے بعض مقامات کے ترجے اور حواشی کے بعض حصے پر علماء کرام کو فی الجملہ اعتراض ہے اس سلسلے میں حضرت مولانا تھانویؒ نے ''اصلاح ترجمہ دہلوی'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے کہ جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ترجے اور حواشی کے اغلاط بیان کئے گئے ہیں، یہی رسالہ ساڈھورہ (انبالہ) کے (صفحہ ۲۰) مطبع ہلالی میں چھپا ہے۔'' [1]

ڈپٹی نذیر احمد کا یہ ترجمہ مع ان کے حواشی کے پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء (۱۳۱۷ھ) میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۰۱ء (۱۳۱۹ھ) میں مطبع انصاری دہلی میں کتابت اور طباعت کے جملہ محاسن کے شائع ہوا ہے اور اب تک اس کے ۱۰-۱۲ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ترجمہ کا نمونہ یہ ہے۔

''ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزا وار) ہے جو تمام جہاں کا پروردگار ہے نہایت رحم والا، مہربان، روز جزا کا حاکم (اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، ہم کو (دین کا) سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا) فضل کیا، نہ ان کا جن پر (تیرا) غضب نازل ہوا اور نہ گمراہ ہوں کا۔'' [2]

---

[1] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۳۱۶

[2] نذیر احمد (شخصیت اور کارنامے) - ڈاکٹر اشفاق اعظمی ص ۳۱۷

مولانا الطاف حسین حالی نے اس ترجمے کی خوبی اور عام پسندی کا جائزہ حسب ذیل الفاظ میں لیا ہے:

''قرآن مجید کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے اس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کی اشاعت کو ابھی سولہ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا اس قلیل مدت میں اس کے ایڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اور کل ایڈیشن کی اب تک کچھ اوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں، اور ان کی مانگ یوما فیوما زیادہ ہوجاتی ہے اس سے بھی زیادہ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمے کو اس وقت سوا سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد کے ترجمے کی اشاعت ہوئی اس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گذر چکے تھے۔ اس عرصہ میں اہل سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا مگر جب ترجمۂ نذیر کی اشاعت روز بروز بڑھنے اور ملک کے ہر طرف سے مانگ آنی شروع ہوئی تو فوراً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی نذیر احمد کی تقلید پر کمر بستہ ہو گئے۔''[1]

مولانا حالی مزید ان کی مختصر الفاظ میں اس ترجمہ کا کتنا اچھا جائزہ لیا ہے جو درج ذیل ہیں:

''خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انھوں نے ہندوستان کے علماء اسلام میں حاصل کیا ہے اس کا صحیح اندازہ لوگ اس وقت کر سکیں گے جب ان کی وفات پر ایک معتد بہ زمانہ گذر جائیگا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حسد و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔''[2]

---

[1] بحوالہ حیات النذیر ص-١٠

[2] بحوالہ حیات النذیر ص-٩-١٠

مولانا حالی کے اس بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ نذیر احمد کا ترجمہ کچھ معاصرین کی بغض و عناد کا بھی شکار تھا ویسے انھوں نے بہت ہی جامع بات کہی ہے کہ شخصیت کے مقام کا صحیح تعین آئندہ نسل ہی کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عزیر ترجمہ قرآن کا زبان وادب کے لحاظ سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ''وہ اس نئے ترجمے میں وہ نئی نئی باتیں پائیں جنھیں ان کا ذوق ادب تلاش کرتا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن مجید اور اس کے بہتر سے بہتر ترجمے میں بھی وہ نسبت نہیں جو آفتاب میں اور ذرے میں ہے (نذیر احمد اس انداز میں بلکہ انھیں لفظوں میں خود بھی سوچتے تھے) تاہم مولوی نذیر احمد نے جس خوبی سے اپنے ذرّے میں اس آفتاب کی جھلک دکھائی ہے۔ کسی دوسرے مترجم سے آج تک نہ ہو سکا بعض محاورات کے نا مناسب استعمال سے قطع نظر کہ یہ ان کے حد سے بڑھے ہوئے شوق زبان دانی کا نتیجہ تھا مولوی نذیر احمد کا ترجمہ صحت زبان اور لطف بیان کے اعتبار سے اردو کے ترجموں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔'' [1]

ڈاکٹر محمد عزیر نے اس تراشے میں خاص اس لفظ کی طرف اشارہ کیا ہے جو کلام اللہ کے ترجمے کے سلسلے میں نذیر احمد کے لئے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قرآن شریف کے متن میں جو کشش ہے وہ ترجمے کی کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتی پھر بھی وہ چاہتے تھے زیادہ نہ ہو تھوڑا بہت ہی اس کا حق ادا ہو جائے محض الفاظ کو اپنی زبان میں منتقل کر لینے سے اور تصنیف میں ادا کئے خیالات کو بیان کر دینے سے کسی کی تہہ میں شروع سے آخر تک موج زیریں کی طرح بہتا رہا، ساتھ ہی ایک تحریف کا خدشہ بھی سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس لیے جب بھی

---

[1] فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۳۱

اس ترجمے کو زیر بحث لانے کا قصد کیا جائے گا ان دونوں سروں کے درمیان ہی کوئی نقطہ ایسا نظر آئیگا جہاں نذیر احمد استاد ملیں گے اس کے ساتھ ہی اس کے پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا، ان میں اس دور کے عوام، سیاسی اور معاشرتی حالت خصوصیت کے ساتھ حامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد عزیر علی گڈھ میگزین ۱۹۶۱ء میں اس ترجمے کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس سلسلے کی (مذہبی) پہلی کتاب ان کا ترجمہ القرآن ہے، کہنے کو تو یہ قرآن کا ترجمہ ہے مگر درحقیقت اردو ادب کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔'' [۱]

یہاں ڈاکٹر صاحب نے اس ترجمے کے ادبی پہلو کو اہمیت دی ہے نذیر احمد خود بھی اس کو مذہبی اور ادبی ہر دو حیثیت سے اپنی تمام کتابوں پر بھاری سمجھتے تھے۔

جب ہم ایک مترجم کی حیثیت سے نذیر احمد کے فن کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں اس وقت بھی ہم کو بہت زیادہ مایوس نہیں ہونا پڑتا کیونکہ ترجمے کی طرف سے غافل رہنے کو کون کہے ان کو اس کا ہمہ وقت اہتمام رہتا ہے ایک ساتھ اس ترجمے میں ان دونوں چیزوں کو نباہنا بڑا مشکل کام تھا کہ عوام کے معتقدات بھی مجروح نہ ہوں اور ترجمے کے فن پر بھی حرف نہ آئے۔ اس ترجمے سے نذیر احمد کے اعلیٰ ذہن کا مکمل طور پر قائل ہونا پڑتا ہے کیونکہ نذیر احمد نے تفسیر کے دلدل سے ترجمے کو اس قدر صفائی سے سے الگ کر لیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید کا اصل ترجمہ وہ ہے جو قوسین کے باہر ہے، قوسین اور حواشی تفسیر کے زمرے میں آتے ہیں۔ نذیر احمد نے یہاں ایک اچھوتی ٹیکنک سے کام لیا ہے۔ وہ یہ کہ قاری ترجمے کے قوسین کے الفاظ کو ملا کر یا ان کو چھوڑ کر دونوں طرح پڑھ سکتا ہے، ترجمہ اپنا پورا مطلب دے گا معنوی اعتبار سے لوگوں کو اس ترجمے پر جس کی وجہ سے اعتراض ہے وہ قوسین کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ ان کی حیثیت بھی

---

[۱] علی گڈھ میگزین ۱۹۶۱ء ص-۲۹

اضافی ہے، اس کو اردو زبان کی فصاحت کو برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے اگر ان الفاظ پر کسی کو اعتراض ہے تو اس کو چھوڑ کر پڑھے۔

جہاں تک ترجمے کے الفاظ کی بات ہے معنوی حیثیت کا تعلق ہے انسان سے غلطی ہو ہی سکتی ہے جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ نذیر احمد کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ملکہ حاصل تھا نیز وہ ترجمے کے فن میں کس قدر مشاق ہو چکے تھے پھر غلطیاں سرزد ہو جانی ناممکنات سے نہیں ہیں نذیر احمد نے ترجمہ کے دیباچہ میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے، کچھ غلطیاں نکل گئی ہوں، ویسے وہ اس ترجمے میں جس قدر محنت کر سکتے تھے انھوں نے اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ایک مذہبی ترجمے کو ادب کے زمرے میں داخل کر دینا بڑا کمال ہے اس ترجمے کو مذہبی سے زیادہ ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن خود ہی اتنا اعلیٰ ادبی کارنامہ ہے جو کسی انسان سے پیدا نہیں ہو سکتا ترجمے کے اس منصب کو نذیر احمد سے پہلے کسی مترجم نے ادا نہیں کیا اور بعد کے مترجم میں بھی اس کی مثال شاذ ہی ہوگی۔

حاشیوں پر تشریحی الفاظ میں بہت سی کام کی چیزیں بھی ہیں ایک زبان کے طالب علم کو ان حاشیوں سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے ان حواشی میں الفاظ اس کے مادے، اس کے مطلب، اس کی قواعد صرف ونحو ان تمام چیزوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے ان لفظوں سے بھی اس میں بحث ملتی ہے جن کو مقطعات کہتے ہیں اور جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا جیسے الم (الف، لام، میم) یہ الفاظ آیتوں کے شروع میں آتے ہیں اور اسرار وحی میں شمار کئے جاتے ہیں ایسے مواد آپ کو قرآن کے اور کسی دوسرے ترجمے میں نہیں مل سکتے۔ ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن میں بحثیں دوسری نوعیت کی ہیں جن کو نظریاتی کہا جا سکتا ہے لیکن نذیر احمد زبان سے زیادہ

بحث کرتے ہیں ان کے اس قسم کے حاشئے بھی قرآن فہمی ہی کی ایک کوشش ہے اس میں کہیں کہیں معتقدات اور نظریات سے بھی بحث کی گئی ہے تشریحات کا زبان والا حصہ ہی عام طور سے سودمند ہے۔ اس حصے سے عربی زبان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور قرآن کی زبان کے اسرار رموز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ترجمۃ القرآن کے ان تمام حصوں کا مجملہ اثر ہے کہ اصل کی ایک جھلک سے ہم روشناس ہوجاتے ہیں نذیر احمد کا اس ترجمے سے خاص یہی مقصد بھی تھا وہ دہلی کالج سے ہی اسی جھلک کی تلاش قرآن شریف کے صفحات پر کرتے ہیں اور اس ترجمے کو کرتے ہوئے بھی اس کی تلاش میں سرگرداں معلوم ہوتے ہیں وہ خود بھی اپنے طور پر قرآن شریف کی اصل اہمیت کو سمجھ چکے تھے اس جستجو میں ان سے کچھ فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہوں تو وہ قابل معافی ہیں۔

قرآن شریف کے ترجمے کے پہلے چند صفحوں میں مختلف موضوعات کے مطابق ابواب قائم کیے گئے ہیں اس کے سامنے آیات کی بھی نشان دہی کردی گئی ہے اس سے قاری دنیاوی ودینوی امور سے متعلق جس موضوع پر قرآن شریف کے ارشادات چاہے مع ترجمہ بآسانی پاسکتا ہے مگر ترجمۃ القرآن میں مختلف موضوعات کو یکجا کرنے کی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی مترجم کو ناچار اسی تسلسل سے چلنا ضروری تھا جس میں آیات کی ترتیب قرآن شریف میں ملتی ہے، یہاں ترجمہ مقدم ہے موضوعات کو ضمناً حیثیت دی گئی ہے مترجم نے موضوعات کے مطابق اہم آیات کو یکجا کرنے کا کام اپنی ایک دوسری اہم مذہبی تصنیف میں کیا ہے جس میں امور قرآنی کو مستند احادیث کے ساتھ مختلف عنوانات سے علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کرکے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کے آگے اس کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے نذیر احمد کی اس اہم مذہبی تصنیف کا نام ''الحقوق والفرائض'' ہے اس کے تین حصے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تصنیف نذیر احمد کی سب سے اہم تصنیف ہے کیونکہ انھوں نے اس تصنیف میں دینوی اور دنیاوی تمام مسائل کے متعلق وافر مواد یکجا کر دیا ہے۔ اگر ایک آدمی ''ایمان باللہ'' کے موضوع پر معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس تصنیف کے اس مخصوص باب میں اس موضوع پر کافی اطمینان بخش مواد مل سکتا ہے۔ نذیر احمد نے اپنی اس تصنیف کو اس باب سے شروع کیا ہے کیونکہ اسلام کی سب سے اول شرط یہی ہے کہ خدا پر ایمان ہو، اس کی دوسری اہم شرط محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان ہے کہ وہ خدا کے رسول ہیں اس کے بعد آسمان کتب اور صحیفوں، خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں، فرشتوں وغیرہ پر بھی ایمان شرط ہے۔ پھر تقدیر پر بھی ایمان شرط ہے۔

اس میں ان تمام چیزوں کو مختلف عنوانات قائم کر کے آیات اور احادیث کے ترجمے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے مصنف نے ہر باب کے آخر میں اس کی تشریح بھی دے دی ہے اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس تصنیف کی بنیادی حیثیت پر غور کیا جائے تو یہ بھی ایک طرح کا ترجمہ کا کام ہے کیونکہ قرآن کے ترجموں اور احادیث کے ترجموں سے فائدہ اٹھا کر اس گرانمایہ مجموعہ کو ترتیب دیا ہے اس تصنیف کو ایک اور زاویئے سے دیکھا جا سکتا ہے، اور یہ زاویہ نگاہ اس کو ایک قانونی تصنیف کی حیثیت عطا کر سکتا ہے اس میں اسلامی قوانین بنائے گئے ہیں اس سے ''مسلم لاً'' کا ایک طالب علم خاطر خواہ استفادہ کر سکتا ہے اس میں اس کو شادی طلاق ''وراثت'' مہر اور حقوق زوجین وغیرہ اہم معاملات کے بارے میں مسلم قوانین مل سکتے ہیں اس لئے مسلم قوانین سے واقفیت کے لئے بھی اس تصنیف کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ قرآن، احادیث کے سمجھنے کے لئے نیز ان سے

واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ترجمۃ القرآن بتاتا ہے کہ قرآن مجید نے اسلام کا کیا نقشہ پیش کیا ہے لیکن ''الحقوق والفرائض'' قرآن مجید سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور بہت سے ایسے مسائل کو بھی پیش کرتا ہے جن پر قرآن خاموش ہے یا جن پر صرف مبہم اشارے ملتے ہیں۔

نذیر احمد نے ایک ایسے نصاب کا خاکہ پیش کیا ہے جس پر اسلام کے نصاب کا اطلاق ہوتا ہے نذیر احمد قرآن مجید کو دستور العمل مانتے ہیں اور تمام قوانین اسلامی یا جتنے علوم مذہبی ہیں سب قرآن کے ماتحت ہیں اور احادیث قرآن کی سب سے جامع اور سب سے مناسب تفسیر میں ہیں اس کے بعد آثار صحابہ، تابعین پھر تبع تابعین سے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں سے مل کر فقہ کا علم وجود میں آتا ہے جس کے متعلق خود نذیر احمد اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''اور یوں قرآن وحدیث، آثار اور اجتہاد سب کا ایک مجموعہ مدون ہوا جس کا نام فقہ ہے۔''[1]

اس نئے علم سے قرآن فہمی میں مدد ملنی چاہیے تھی لیکن اس کے برعکس یہ علم اپنے مقصد سے دور ہوتا گیا اور یہ خود بھی ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ گیا جس سے مسلمان قرآن فہمی سے دور ہوتا گیا درحقیقت احادیث جو ہیں اس سے مذہبی تاریخ مرتب ہوتی ہے چنانچہ احادیث کی ترتیب اور تحقیق کو ایک بہت ہی زبردست کارنامہ سمجھتے ہیں مگر مذہبی علوم کے درس تدریس کا طریقہ اتنا ناقص تھا کہ قرآن مجید کے سمجھنے میں اس سے مدد ملنے کی جگہ اور دشواری پیدا ہوگئی چنانچہ اس خیال کی صراحت انھیں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''غرض ہمارا تعلیمی کورس بنایا تو گیا قرآن کو سمجھانے کے لئے مگر ہم اسی کورس میں الجھے رہے اور کورس کی الجھن نے قرآن کے سمجھنے کی نوبت نہ

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص-۷۶۳

آنے دی کورس کا بجائے خود انبار تھا، اسی کا ڈھونا ہم کو مشکل پڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور ہونا ہی تھا کہ قرآن نے جو ولولے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیے تھے وہ ٹھنڈے پڑتے پڑتے صرف نام کے مسلمان رہ گئے۔" [1]

رام بابو سکسینہ نے نذیر احمد کی اس تصنیف کو جو کہ ایک طرح سے ترجمہ ہی ہے نہایت ہی جامع اور مکمل کہا ہے۔

ڈاکٹر محمد عزیر نے اپنے ایک مقالہ "نذیر احمد کی مشہور کتابیں" میں جو ۱۹۶۱ء کی علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا "الحقوق والفرائض" کو اسلامی تعلیمات کا انسائیکلوپیڈیا کہا ہے بعض دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔

"الحقوق والفرائض" کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی اہم تصنیف "سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ" میں لکھتے ہیں:

"غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا (جسے جدید علم کی اہم تصنیف کہا جا سکتا ہے) طرز استدلال جدید نہیں، اس کا رنگ شاہ ولی اللہؒ اور دیگر مسلم علماء کی تصانیف سے ملتا جلتا ہے نذیر احمد کی کتابوں میں مغربی حکمت و فلسفہ استفادہ بہت کم نظر آتا ہے اور اس کا عام طریق بحث نقطۂ نظر قدیم ہی معلوم ہوتا ہے، کتاب کی ترتیب اور طرز تصنیف بھی عام پسند نہیں اور افسوس یہ ہے کہ اس کو دلچسپ بنانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی، یہ ایک قانون کی کتاب کی طرح خشک ہے گو کہ برمحل واضح اور قطعی ہونے کے لحاظ سے بھی ایک قانون کی کتاب ہی کی طرح ہے۔" [2]

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص۲۷۶

[2] سر سید احمد کاں اور ان کے نامور رفقاء - ڈاکٹر سید عبداللہ ص۹۹-۱۰۰

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اس کتاب پر کئی اعتراضات کئے ہیں اور خود ہی ان کا جواب بھی دے دیا ہے پہلے بھی مولانا ابوالکلام آزاد اور نذیر احمد کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قرآن جو ایک دستور العمل ہے یعنی زندگی کا قانون ہے اس کی شرحیں بھی پہلے واضح، براہ راست غیر پیچیدہ انداز اظہار میں لکھی جاتی تھیں اور جو لوگ کہ بزرگوں میں شمار کئے جاتے ہیں ان لوگوں کا مذہب سمجھانے کا ڈھنگ بھی براہ راست ہوتا تھا لیکن جدید فقہ اور پیچیدہ مذہبی علوم نے اصل مقصود کو ضبط کر دینے کی حد تک پیچیدہ بنا دیا ہے اس کی وجہ سے مطالب القرآن میں آسانی ہونے کے بجائے دشواریاں پیدا ہوگئی۔ شاید انھیں باتوں کی بناء پر جامع حیات النذیر نے، نذیر احمد کی اس تصنیف کا موازنہ حجت البالغتہ سے کیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی الحقوق والفرائض کو حجتہ البالغتہ کی قطار میں شمار کیا ہے لیکن انھوں نے وہیں باہمی مماثلث کو بھی ظاہر کر دیا ہے جس سے کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس تصنیف کو دلچسپ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، نذیر احمد نے قصداً اس سے احتراز کیا ہے ان کی عام شگفتگی اور شوخ مزاجی بھی اس میں ناپید ہی سی ہے محاوروں اور روزمروں کے جملوں کی کم ہی تہہ لگایا ہے اور جو چند محاورے استعمال ہو بھی گئے ہیں تو اس میں تخلیقی عمل کا بالکل تصرف نہیں ہے۔ ناولوں میں لکچروں میں اکثر مشہور محاوروں کو اپنے منشاء کے مطابق بدل لیا گیا ہے کہیں کہیں محاورے کی یہ نئی شکل مزیدار بھی ہوجاتی ہے لیکن اس تصنیف میں ترجمتہ القرآن میں بھی قرآن کے روح ادب کو اسیر کرنے کی کوشش ملتی ہے مگر یہاں اس دستور العمل کو قائم کیا جو اس دور کے عام مسلمانوں کے لئے قرآن اور حدیث میں بند پڑا تھا جہاں تک ان کی رسائی نہیں۔

امہات الامۃ، نذیر احمد کی آخری مکمل تصنیف ہے یہ ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ اس کتاب کو نذیر احمد نے ایک عیسائی مصنف کی تصنیف ''امہات المومنین'' کے جواب میں تصنیف فرمائی تھی اس عیسائی مصنف احمد شاہ شائق نے حضور اکرام ﷺ کی ذات اقدس پر تکثیر ازدواج کو لے کر کیچڑ اچھالنے کی گستاخی کی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کا ہر کام اسلام کی بہتری کے لیے ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے کوئی کام بشریت کے تقاضے سے نہیں کیا۔ آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد خدا کی رضا جوئی اور خلق اللہ کو اسلام کی دعوت دینا تھا۔ نذیر احمد نے اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تکثیر ازدواج بھی منشاء ایزدی ہی تھا اس میں بھی اسلام کی بہتری پوشیدہ تھی دوسرے آپ ﷺ کا یہ عمل شان نبوت کے عین مطابق تھا۔

دراصل یہ کتاب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں کے لئے لکھی تھی اس کے علاوہ اس کی جگہ انگریزی دانوں کے یہاں تھی جو جدید تحقیق سے مانوس تھے جس کے ذریعہ سے وہ اس ظاہر سے گمراہ نہ ہو کر اس کی معنویت کو اہمیت دیتے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکتے۔ یہاں مصلحت سے زیادہ حقیقت درکار تھی یہاں دوسروں کے عیوب گنانے سے کام چلنے والا نہیں تھا بلکہ اپنے امور پر عائد کئے گئے فرد جرم کی جواب دہی کرنی تھی۔ کسی کے الزام کے بدلے الزام لگانے دینے سے اپنا جرم تو ختم نہیں ہو جاتا۔ یہاں اپنے اوپر لگائے گئے الزمام کو غلط ثابت کرنا تھا یہ انداز ہ مذہبی تخلیق کے بالکل جدید رجحان پر مبنی تھا یہاں عقائد اسلام سے کام چلنے والا نہیں تھا بلکہ خالص سائنسی انداز میں عقل کی سطح پر سوچنے کی ضرورت تھی یہی نذیر احمد نے کیا۔ امہات الامۃ کے ہنگامے مولوی عبدالحق کا غم و غصے کا اظہار کسی تعصب سے زیادہ اور دوزبان کے ایک پر خلوص خادم کی بے جا تذلیل کی وجہ سے بھی تھا۔

اسی طرح انھوں نے کچھ اپنے ذاتی دیگر مذہبی کتابوں لوگوں کے ترجمہ شدہ رسالوں و نیز میگزین میں چھپے دوسرے لوگوں کے مذہبی آرٹیکل سے اور اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے سہارے انھوں نے ایک مذہبی کتاب اجتہاد کی تصنیف کی ہے اور اپنی اس تصنیف کے متعلق مطالب القرآن کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ:

''بے شک اکثر مذاہب کا اصل وضع میں پہلی حال اور پیروں کی بعد کی بڑھائی ہوئی پابندیاں علیحدہ علیحدہ، مگر اسلام تو اصل وضع میں مرادف آزادی ہے، اس میں جو کچھ پابندیاں ہیں ان میں سے جو اصل وضع میں ہیں چونکہ سرتا سر مطابق فطرتا ہیں اور ان کا مطابق فطرتا ہونا ہم نے شرح و اپنی کتاب اجتہاد میں ثابت کر دیا ہے۔'' [1]

نذیر احمد کی پوری کوشش اسلام کو ایک دین فطرت ثابت کرنے کی رہی ہے اس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اسلامی عقائد کو عقلی دلیلوں سے ثابت کیا ہے اس تصنیف میں وجود باری تعالیٰ توحید، کثرت، رسالت، پیغمبر اسلام کی صداقت نزول کی اصلی غرض، دیگر مذاہب کا اسلام سے مقابلہ، دین و دنیا کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کے مضامین بیان کئے گئے ہیں نذیر احمد خود کہتے تھے وہ اجتہادی مسلمان ہیں انھوں نے مذہب کو سمجھ کر اپنایا ہے یہاں ذیل میں انھوں نے اپنے انھیں افکار کو قلم بند کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھ کو خیال آیا کہ میں کیوں مسلمان ہوں خیالات کا تو یہ حال ہے کہ اِدھر آئے اُدھر غائب، طبیعت دوسری طرف متوجہ ہوگئی مگر یہ خیال کہ میں کیوں مسلمان ہوں کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند ٹالینا چاہتا تھا مگر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا یہاں تک کہ میں کئی سال متواتر اسی خیال میں غلطاں و پیچاں

---

[1] مطالب القرآن ص ۶

رہا، خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک مگر ایسا معلوم ہوا کہ ایک
سے دو ہو گیا ہوں ایک حیثیت سے سائل اور ایک حیثیت سے مجیب، میں نہیں
کہہ سکتا کہ ایسے خیالات دوسرے مسلمانوں کو بھی آئے ہیں کہ نہیں میں تو کہتا
ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کو ضرورت سمجھ کر کسی مذہب کا معتقد ہے کبھی کبھی
اپنے نفس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کیوں مبتلائے ہندو یا عیسائی یا یہودی پارسی یا
کیا کیا ہے ایسا خیال کرنے سے قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کریگا تاہم وہ
حق سعی بجالایا اور اس کے لئے ہی وہ حق ہے جو اس نے سمجھا۔" [1]

اس تصنیف میں نذیر احمد نے ائمہ اثنا عشر کے متعلق، خلفائے راشدین کے متعلق اور چند اہم صحابیوں کے متعلق بھی ذکر کیا ہے اس کی تصنیف تک لوگوں نے ان کی تصنیفات کو یکساں وقعت کی نظر سے دیکھا۔

مطالب القرآن نذیر احمد کی آخری نامکمل تصنیف بتائی جاتی ہے غالباً یہ کتاب ۱۸۹۰ء سے قبل لکھی گئی اگر نذیر احمد امہات الامۃ کے حادثے سے دوچار نہ ہوئے ہوتے تو یہ تصنیف مکمل ہوسکتی تھی اس طرح قرآن شریف کے ایک پہلے ادبی ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ تفسیر بھی ہمارے ہاتھ ہوتی۔

نذیر احمد نے بہت پہلے ہی اردو میں قرآن شریف پیش کرنے کو سوچا تھا مگر اس وقت کے قدامت پسند مولویوں سے ڈرتے تھے۔ نتیجتاً یہ کام ٹلتا گیا اور زندگی کے آخر میں اس وقت اس کام کو کرنے کے لئے سوچا جب ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس پر بھی قوم نے ان کے کئی سال چھین لیے۔ اس طرح مطالب القرآن کے چھ حصوں میں سے ایک حصے کی تصنیف ہو سکی

---

۱ بحوالہ علی گڈھ میگزین ۱۹۶۱ء ص ۳۱-۳۲

جس کو ان کے لڑکے مولوی بشیر الدین احمد نے ۱۹۱۸ء میں شمس پریس سے جو کہ نذیر احمد کا ہی پریس تھا شائع کیا۔

نذیر احمد نے اس تفسیر کا انداز بہت ہی انوکھا رکھا ہے اس میں انھوں نے قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب سے ان کی تفسیر نہیں لکھی بلکہ قرآن کے تمام مضامین پر غور کیا اور ان تمام مضامین کو چھ خاص عنوانات (۱) معتقدات (۲) احکام متعلقہ عبادت و معاملات (۳) تاریخی مضامین و قصص (۴) پیغمبر صاحب اور ان کے معاصرین کے حالات (۵) عالم معاد (۶) متفرقات میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے اس کتاب کا ایک ایک حصہ مقرر کیا مگر اس کتاب کا صرف ایک ہی حصہ ''معتقدات'' مکمل ہو سکا باقی پانچ حصے کے لکھنے کا ان کی زندگی نے موقع ہی نہیں دیا یہ پہلا حصہ مع دیباچہ کے لمبی سائز کے ۱۴۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اس کتاب میں قرآن کی آیات اور قرآن کی مختلف سورۃ کو جس میں کسی مخصوص بات کے متعلق بیان نقل کیا گیا ہے اور اس کا ترجمہ سامنے دے دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے اپنی تفسیر و تشریح بھی' نذیر احمد نے ترجمہ قرآن کے لئے دعویٰ کیا ہے کہ اس ترجمے میں قرآن کے کسی بھی ترجمے سے مدد نہیں لی گئی ہے یہی بات ''الحقوق والفرائض''، ''اجتہاد''، ''مطالب القرآن'' کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے ان تمام مذہبی تصانیف میں براہ راست قرآن سے اخذ کیا گیا ہے یہ بات ترجمہ القرآن کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے جس میں خدائے پاک کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں اس کام میں اولیت نذیر احمد کی ہی حاصل ہے اور دوسرے میں بنیادی اہمیت دینوی اور دنیاوی مسائل کو دی گئی ہے دوسرے میں اہم اور مستند حدیثوں سے بھی مدد لی گئی ہے یہ کتاب تو قرآن میں بیان کیے گئے مضامین سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

نذیر احمد کی تقریروں سے ان کے خیالوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس سے ان کے مذہبی تصنیفوں کے منبع کا سراغ بہ آسانی لگ سکتا ہے اور ان کی تصنیف کا مقصد بخوبی ذہن نشین ہوسکتا ہے جیسے:

''......مگر میں تو اپنی طرف سے گوش گذار کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ میں نے اپنے ترجمۂ قرآن کے شروع میں مطالب قرآن کی مطلب وار ایک فہرست بنا کر لگا دی ہے یعنی ہر ایک مضمون کی جتنی آیتیں قرآن میں جہاں جہاں ہیں سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے بس مذہبی مواد تو تیار ہے اب اس میں سے نصابوں کا انتخاب کرنا ہے اگر مجھ سے رائے لی جائے تو میں آدمی کی عمر کے اعتبار سے نصابوں کو ترتیب دوں، آدمی کی عمر کے ہر حصے میں ثم انشا خلقا آخر کا مصداق ہوتا رہتا ہے، وہ پانچ حصے ہیں طفلی، عنفوان، شباب، وقوف، پیری اور ہر ایک حصہ معاد کا ہے کہ وہ اس زندگی سے متعلق ہے جو بعد مرگ پیش آئیگی میں تو اس طرح کے نصاب کبھی کے بنا چکا ہوتا مگر لکیروں کے فقیروں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، نصاب بھی بناؤں اور میں آپ ہی اس کو بیٹھا پڑھتا بھی رہوں۔ اور ہدف لعنت بنوں سو الگ، جو لوگ افارم افارم (اصلاح اصلاح) پکار رہے ہیں چاہے کسی غرض سے پکارتے ہوں میری آج کی بات سن رکھیں ولیبلغ النساھدُ کہ مسلمانوں کی قومی افارم تو جب کبھی ہوگی اس صورت سے ہوگی کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کی جائے اور مسلمانوں کے مذہب کی اصلاح جب کبھی ہوگی اسی صورت سے ہوگی کہ یہ لوگ قرآن کے سوائے کسی مذہبی کتاب کو ہاتھ نہ لگانے پائیں۔ تفسیر، حدیث یا فقہ، قرآن ہی ایک کتاب ہے جس پر تمام اسلامی فرقوں کا اجماع ہے۔ باوجود اختلاف باہمی اختلاف

ہرگز قرآن کی تعلیم نہیں، بلکہ تعلیم اگر ہے تو تفاسیر کی، احادیث کی، مسائل فقہ کی، یا کوئی صاحب مجھکو بتادیں کہ اختلاف آیا تو کہاں سے آیا، قرآن کے حق میں خود خدائے تعالیٰ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان فرماتا ہے، ......یعنی قرآن منزل یا اللہ ہونے کی دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیم میں اختلاف نہیں۔'' [1]

اس لکچروں کے علاوہ بھی نذیر احمد نے کئی لکچروں میں دینی نصاب کا ذکر چھیڑا ہے انھوں نے مسلمانوں کے لئے دینی نصاب کی تیاری پر زور دیا ہے اور آخر میں خود ہی اپنے طور پر مختلف انداز سے اس کو تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کی تیاری میں مرکزی حیثیت قرآن مجید کے خیالات، دستور العمل اور ادب کو دی گئی ہے نذیر احمد کو یقین تھا کہ قرآن شریف سے براہ راست رشتہ قائم کرنے سے ہی باہمی تفرقوں کا خاتمہ ممکن ہے مسلمانوں کے باہم ترفقوں کو ختم کرنے کی غرض ہی سے انھوں نے دینی کتابوں کی تصنیف کی اوّل ان کی تیاری میں حتی الامکان قرآن ہی سے مدد لیا۔ نذیر احمد کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے آپسی اختلافات ختم کر دیئے جائیں اور مذہب اسلام ایک مرتبہ پھر اسی طرح دنیا کے لئے راہ ہدایت بن جائے۔

نذیر احمد نے متعدد انگریزی ترجموں اور عربی ترجموں اور دینی تصنیفوں سے اور دو زبان میں گرانقدر سرمائے کا اضافہ کیا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے پینل کوڈ کے ترجموں کے ذریعہ اردو میں اصطلاح سازی کی بنیاد مستحکم کی اور اسے ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا مہدی افادی کو اصطلاحیں وضع کرنے کی جو عادت سی ہوگئی تھی بہت ممکن ہے کہ یہ نذیر احمد کی اثر پذیری کا نتیجہ ہو۔ اپنے ترجموں سے انھوں نے اردو میں اس فن کی ایک جاندار روایت قائم کی، دوسری

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم، درباری لکچر نمبر ۴۰-۱۹۰۳ء بمقام دہلی ص-۶۰-۵۹

زبانوں سے خیالات کواخذ کر کے ان کو اپنے ماحول میں پیش کرنے کا طریقہ بھی بتایا اور اس کے رموز واسرار سے بھی آگاہ کیا۔

نذیر احمد نے اپنی محنت اعلیٰ ذہانت سے ترجموں کو تخلیق کا درجہ عطا کیا اور وقت کے لحاظ سے اس کام کے لئے کتابوں کے انتخاب کا گر بھی بتایا سر چشمہ زبانوں سے اپنی زبان کی ترقی کے لئے استفادہ کرنے کا طریقہ بھی واضع کیا ان کے ترجموں کے زریعہ سے اردو زبان میں بے شمار الفاظ داخل ہوئے اور بہت سے غیر مانوس الفاظ زبان زدعوام ہو گئے۔لفظوں کی بعض نامانوس شکلوں کو بھی انھوں نے اپنے ترجموں کے ذریعہ رواں کیا وغیرہ ان کی اصطلاحیں واضع اور براہ راست ہوتی ہیں۔ان کے ترجمے اصل تصنیف کی روح کو اسیر کر لیتے ہیں جو ترجمے کا سب سے بڑا وصف ہے اس طرح نذیر احمد کے تراجم بھی ان کے اہم کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں اور ان کی دینی کتابیں علی گڈھ تحریک کے ایک بڑے مشن کو پورا کرتی ہیں۔

انگریزی ترجموں ہی سے نذیر احمد کے اسلوب تحریر کی تشکیل ہوئی جو متنوع، رنگا رنگ، دلکش ہونے کے علاوہ ایک انفرادی شان بھی رکھتا ہے، انگریزی ترجموں کا یہ بڑا اہم افادی پہلو ہے کہ اردو زبان کو انھیں ترجموں کے سبب ایک عمدہ انداز بیان ہاتھ لگا۔

❑❑❑❑

باب پنجم

ڈپٹی نذیر احمد کی دیگر تصنیفات و تالیفات میں اصلاحی رجحانات

اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ڈکٹر نذیر احمد کا ایک اہم مقام ہے۔ انھیں اردو کا پہلا ناول نگار بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک خوش بیان خطیب اور ماہر تعلیم و مترجم تھے اور عربی زبان و ادب کے عالم بھی۔ ان کا ترجمان القرآن اور تفسیر القرآن' علوم اسلامیہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تصنیف ''الحقوق الفرائض'' مسلمانوں کی صدیوں پرانی اخلاقیات اور فلسفے، طرز حکومت اور رسم و روایات کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس تصنیف کو قرآن و حدیث نیز اسلامی شریعت کی اساسی تفسیر بھی کہا جاسکتا ہے۔ عربی علوم و نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں نذیر احمد نے سرسیدؒ کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا لیکن افسانوی ادب کے میدان میں نذیر احمد کے کارناموں کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ انھوں نے سات ناول لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- مراۃ العروس (۱۸۶۹ء)
۲- بنات النعش (۱۸۷۲ء)
۳- توبۃ النصوص (۱۸۷۴ء)
۴- فسانۂ مبتلا یا محصنات (۱۸۸۵ء)
۵- ابن الوقت (۱۸۸۸ء)
۶- ایامیٰ (۱۸۹۱ء)

۷- رویائے صادقہ (۱۸۹۲ء)

علاوہ ازیں انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی جیسے:

مذہب، اخلاق

۱- چند پند سودمند (۱۸۹۶ء)

۲- منتخب الحکایات —— ۷۷ حکایات (۱۸۶۹ء)

۳- موعظ حسنہ —— خطوط بنام صاحبزادہ بشیر الدین احمد (۱۸۸۷ء)

۴- ترجمۃ القرآن (۱۸۹۶ء)

۵- الحقوق والفرائض (تین حصے) (۱۹۰۶ء)

۶- ادعیۃ القرآن

۷- امہات الامہ (۱۹۰۶ء) (دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء)

۸- مطالب القرآن (نامکمل) (۱۹۰۶ء)

علمی

۱- حرف صغیر (قواعد فارسی) (۱۸۷۰ء)

۲- مبادی الحکمت (۱۸۷۰ء)

۳- رسم الخط (۱۹۱۲ء)

خطبات

۱- لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ میر کرامت اللہ) (۱۸۹۰ء)

۲- لکچروں کا مجموعہ (حصہ اول ۹۵-۱۸۸۸ء تک) (مرتبہ بشیر الدین احمد-۱۹۱۸ء)

۳- لکچروں کا مجموعہ (حصہ دوم ۱۹۰۵-۱۸۹۵ء تک) (مرتبہ بشیر الدین احمد-۱۹۱۸ء)

تراجم

۱- تعزیرات ہند (شریک مترجم-۱۸۶۴ء)

۲- مصائب غدر (مصنفہ ولیم ایڈورڈز-۱۸۶۳ء) (دوسرا ایڈیشن ۱۸۹۶ء)

۳- سموات (غیر مطبوعہ-۱۸۷۲ء)

۴- تاریخ دربار تاج پوشی (۱۹۵۳ء)

شاعری

۱- نصاب خسرو (امیر خسرو کی خالق باری کی منظوم نعت عربی الفاظ ۲۵۰، فارسی ۵۰۸)
(۱۸۷۰ء)

۲- نظم بے نظیر (قومی، ملی اور اصلاحی موضوعات پر ۱۴۵ اردو ۷ عربی نظمیں) (۱۹۰۹ء)

اس کے علاوہ ان کی ایک اور تصنیف اجتہاد ہے جو کہ مذہبی ہے۔

اگر چہ ناولوں کے موعظانہ اور مذہبی تصانیف کے باعث انھیں ملائیت کا علم بردار سمجھا جاتا ہے لیکن وہ تنگ نظر ملا نہ تھے بلکہ اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصے روشن خیال تھے۔ ان کو مذہب سے لگاؤ تو تھا مگر تشددانہ رویہ نہ تھا اسی لیے سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے مثبت پہلوؤں کے حامی تھے۔ مگر مولانا حالی کے مانند ان کے چیلے بھی نہ تھے۔ سقوط دہلی کے بعد انگریزی عمل داری میں پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ اقدار دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ

عوامی زندگی میں انگریزی تعلیم اور نئے خیالات کے اسلحہ سے لیس متوسط طبقہ ابھر رہا تھا اور نذیر احمد، مولانا صلاح الدین کے بقول:

> ''نچلے اور درمیانے طبقہ کے موید تھے اور اسے بڑھانے اور جگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔''[1]

نذیر احمد اپنے عہد کی پیداوار تھے اس لیے ان کی شخصیت بھی ان تضادات کا مجموعہ ہے جو اس دور سے مخصوص تھے اور یہی عصری تضادات ان کے ناولوں میں بھی جھلک مارتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو صحیح معنوں میں نذیر احمد روح عصر کے ترجمان اور ماحول کے مرقع نگار تھے اور یہ کوئی کم اہم خصوصیت نہیں ہے چنانچہ اپنی تحریر اور تقریر سے وہ نہ صرف خود اسی فضا کا ایک حصہ بن چکے تھے جس میں وہ سانس لے رہے تھے بلکہ اس سے وابستہ مقاصد کے لیے باعث تقویت بھی ثابت ہو رہے تھے۔ شاید ان بزرگوں کی یہ مساعی غلط نہ ہو اور تقاضۂ وقت کے عین مطابق ہو۔ جہاں تک سماج سدھار، تعلیم نسواں، توہمات اور رسوم ورواجات کے نقصانات اجاگر کرنے، ترقی کی دوڑ میں شمولیت کی تلقین اور علوم وفنون کے حصول سے ذہنی کشادگی پیدا کرنے کا تعلق ہے تو یہ قابل اعتراض نہیں۔ ۱۸۵۷ء نے قدیم اشرفیہ کو ختم کر دیا تھا اور ان کی جگہ وہ نیا متوسط طبقہ میدان عمل میں مصروف کار نظر آ رہا تھا جس نے حصول تعلیم کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت میں عزت، تحفظ اور فارغ البالی دیکھی، روایتی جاگردارانہ اقدار متزلزل تھیں اور اکبر الہ آبادی کی مدافعانہ شاعری کے باوجود مغربی تمدن فروغ پا رہا تھا۔ الغرض بحیثیت مجموعی میتھو آرنلڈ والی بات تھی کہ ایک دنیا مر رہی تھی مگر دوسری نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۱۲

چنانچہ اس تغیر پذیر زمانے میں مولوی نذیر احمد نے سب سے زیادہ اس بات پر (اس پہلو پر) غور کرنا شروع کیا کہ وہ کونسی وجہ ہے کہ دور دیش سے آئے ہوئے یہ حکمراں (انگریز) لوگ ہم ہندوستانیوں پر حکومت کررہے ہیں چنانچہ ان کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ جدید تعلیم جو کہ وقت کا تقاضہ بھی ہے انگریز لوگ پوری طرح سے جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ ان جدید تقاضوں کی تکمیل کے بغیر کوئی بھی معاشرہ مقبول و مہذب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ درج ذیل ایک لکچر میں انھوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم کو دنیاوی فلاح و بہبود کا سبب بتایا ہے اور مسلمانوں کو سائنس کی تعلیم کی طرف راغب کیا فرماتے ہیں:

> ''میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے۔ پس تعلیم کے مفید و نامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسائش، انسان کی عافیت تو تعلیم کی دو شاخیں ہو گئیں۔ جو تعلیم انسان کے قوائے عقلی کو ڈیولپ (Develop) کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے اور جو تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے اس کو دینی۔ یہ امر داخل بدیت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل، اسٹیمر، تار برقی اور انواع و اقسام کی مشینیں انھیں زوروں کے آثار ہیں۔ دو چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا' خدا علیم ہے کہ ان کا کنسٹرکشن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا' اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا! آب و ہوا وہی ہے جو پہلے تھی، لیکن تاریخ بتا رہی ہے اب سے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے یا اور بہت

سے ملک ہیں جن کی آب و ہوا یورپ کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے اور وہاں کے باشندے کندۂ ناتراش ہیں، ہونہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دی جا رہی ہے اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی اسے اس کی ابجد نیٹوز (Natives) کو پڑھانا شروع کی ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ یعنی لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لایا اور کوئی اس سے بھٹک رہا۔

صدعنہ میں کم نصیب، بدقسمت، بدبخت مسلمان ہیں جو اب تک اس جدید تعلیم کی طرف پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ دنیاوی بہبود و فلاح تو بدون سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں مگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوق میں بند ہیں۔ ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے رہو آگے اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو، جھڑکیاں سنو، جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا نیستا ہو چکے تو بھیک مانگو، میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر ڈوب مرو۔" [1]

اس طویل اقتباس سے نذیر احمد کے نظریہ تعلیم و ترقی اور خصوصاً سائنسی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد دنیاوی فلاح و بہبود اور قوائے عقلی کے نشو و نما کے لیے سائنس کی تعلیم کے حصول پر زور دیتے ہیں۔

چنانچہ اب انھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ کس طرح قوم کے بچوں کو پڑھایا جائے، کس طرح ان کو نئے پیکر میں ڈھالا جائے۔ چنانچہ جب ان کی نظر اپنے ہی بچوں کی کتابوں پر پڑی تو ان کو

---

[1] نذیر احمد ناول (تنقیدی مطالعہ) —— ڈاکٹر اشفاق احمد خاں

ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ چوں کہ عورتیں اپنے توہمات، جہالت اور کج روی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج ومصیبت رہا کرتی ہیں۔ ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی قدر دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے، مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا۔ تب انھوں نے خود اپنے بچوں کے لیے ایک کتاب کا منصوبہ بنایا اور روزانہ تھوڑا تھوڑا لکھ کر انھیں پڑھنے کے لیے دینے لگے۔ انجام کار ایک کتاب تیار ہوگئی جس کا نام مراۃ العروس رکھا۔

مراۃ العروس کا چرچا محلے میں ہونے لگا جس کسی نے سنا ریجھ گیا۔ اونچے اونچے گھروں میں کتاب منگوائی گئی نقل لینے کے ارادے ہوئے۔ [1]

عورتوں کے اندر اس کتاب کی بے حد مانگ ہوئی اور یہ کتاب روز بروز عورتوں میں مقبول ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ خود ڈپٹی نذیر احمد فرماتے ہیں:

> ''جب میں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے اور خوب دل لگا کر پڑھتی اور سنتی ہیں تب اس کو جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر مدارس ممالک شمال ومغربی کے ذریعہ سے سرکار میں پیش کیا۔ سرکاری قدردانی نے تو میری آبرو اور اس کتاب کی قدر وقیمت کو ایسا بڑھایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں نے خاطر خواہ اپنی مراد اور محنت کی داد پائی۔'' [2]

ڈپٹی نذیر احمد نے بنات النعش کے دیباچہ میں خود بھی مقصد تحریر کے ضمن میں یہی لکھا:

---

[1] دیباچہ مراۃ العروس

[2] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد - ڈپٹی نذیر احمد ص ۷۹۲

''مراۃ العروس سے تعلیم اخلاق وخانہ داری مقصود تھی''

جب کہ ''بنات النعش'' کے بارے میں انھوں نے لکھا:

''اس سے وہ بھی ہے مگر ضمناً اور معلومات علمی خاصہ۔''

غرض کہ اس میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک سبق آموز کہانی پیش کی گئی ہے اور مسلمان شرفا کی خاندانی زندگی، امور خانہ داری، حسن معاشرت، تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کی ہے۔

مراۃ العروس کے بعد انھوں نے ''بنات النعش'' تحریر فرمایا جو کہ ۱۸۷۳ء میں منظر عام پر آئی جو کہ مراۃ العروس کا دوسرا حصہ ہے۔

اس کتاب میں بھی امور خانہ داری اور معلومات عام کی تعلیم قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں قصے کی شکل میں حسن آراء نام کا ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو کہ بڑے خاندان کی لڑکی تھی۔ بے جا ناز برداری کے نتیجے میں انتہائی مغرور اور نک چڑھی ہوگئی تھی۔ اس کے مزاج افتاد ایسی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا' نہ ماں کا ادب نہ آیا کا لحاظ' نہ باپ کا ڈر نہ بھائیوں سے ملاپ۔ نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں' لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں۔ غرض حسن آراء سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔

چنانچہ گھر والوں نے سوچا کہ اس کو تعلیم کے لیے کسی کے پاس لے چلیں تا کہ اس کے اندر کچھ سلیقہ اور تہذیب آسکے۔ یہ سب باتیں گھر میں چل رہی تھیں کہ حسن آراء کی خالہ شادمانی بیگم

اپنی بہن سلطانہ بیگم سے ملاقات کو آ گئیں اور حسن آراء کی شرارتوں کو دیکھنے کے بعد اس کو تعلیم کے لیے کسی استانی سے پڑھانے کی بات کہنے لگیں۔ چنانچہ تلاش کے بعد ایک استانی جن کا نام اصغری ہے پڑوس کے مولوی محمد فاضل کی چھوٹی بہو مل گئیں اور انھیں کے سپرد حسن آراء کو گھر والوں نے کر دیا۔

حسن آراء کمال بدتمیزی سے یہاں بھی پیش آئی۔ اپنی ہم مکتب لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کے ساتھ ساتھ بدتمیزی بھی کرنے لگی۔ شروع شروع میں تو استانی (اصغری) کو بہت ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے حسن اخلاق سے حسن آراء بہت ہی متاثر ہوئی اور اب دھیرے دھیرے اس کی شرارتیں کم ہونے لگیں۔ اصغری بیگم (جس کو محلے والے تمیز دار بہو کے نام سے جانتے تھے) نے حسن آراء کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات خاص طور پر ایک لڑکی (عورت) کو معاشرہ میں اور خاص کر اپنے گھر کی تمام ذمہ داریوں کو کس طرح نبھانا پڑتا ہے اور گھر کے تمام افراد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے اور حفظ مراتب کے لحاظ کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے پورے طور پر سمجھا دیا۔ رفتہ رفتہ حسن آراء کی عادتوں میں تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اصغری بیگم نے حساب و کتاب اور لین دین کے تمام پہلوؤں کو حسن آراء کو بخوبی سمجھا دیا اور پھر اصغری بیگم نے حسن آراء کو پڑھائی کی طرف متوجہ کیا کہ کس طرح ایک عمدہ اور اچھی کتاب پڑھ کر انسان جس ملک میں چاہے زندگی بسر کرے۔ پڑھنا حاضرات کا ایک عجیب و غریب علم ہے جس کو چاہا پکڑ بلایا اور اسی سے باتیں کرنے لگے۔

اسی طرح معلومات عامہ کے بارے میں بھی استانی جی نے حسن آراء کو سمجھانا شروع کیا کہ کس طرح زمیں ہر شئے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جو چیز اوپر کو پھینکتے ہیں وہ کچھ دور تک پھینکنے

والے کے زوراورزبردستی سےاوپر کو چلی جاتی ہے پھر زمین کی کشش اس کو نیچے کھینچ لاتی ہے۔ ہر چیز کا اک مخصوص وزن ہوتا ہے۔ کوئی چیز ہلکی ہے کوئی بھاری ہے، ہوا کا دباؤ بھی ہوتا ہے اور ہر شئے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح خوردبین کی ایجاد ہے۔ بجلی، ہوا، بادل، روشنی کی رفتار یہ سب ناپ تول کے حساب سے چلتے ہیں۔ ان تمام علوم کا حسن آراء کو علم ہوگیا۔ ہر طرح علم سے آراستہ و پیراستہ ہوکر گھر کو رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔

اس عرصے میں حسن آراء نے سارا قرآن مجید پڑھا اور چونکہ دوسپارے روز تلاوت کا معمول تھا اور یاد ایسا تھا کہ گویا حفظ ہے۔ اُردو بے تکان، بے تکلف لکھتی پڑھتی تھی۔ قرآن کا ترجمہ، کنزالمصلّیٰ، قیامت نامہ، راہِ نجات، وفات نامہ، قصہ شاہ روم، سیاہی نامہ، معجزہ شاہ یمن، رسالہ مولود شریف اتنی تو مذہبی کتابیں اس کی نظر سے گذر گئیں اس کے علاوہ حساب کے ضروری قاعدے کسر تک اور ہندوستان کا جغرافیہ، ہندوستان کی تاریخ، چند پند، منتخب الحکایت، مراۃ العروس سب کچھ پڑھ کر فارغ ہوگئی۔ اُردو کے اخبار بے تامل پڑھ کر سمجھ لیا کرتی تھی اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ خانہ داری کے جو ہنر عورتوں کو درکار ہیں سب اس نے حاصل کیے اور معلومات مفید کا اتنا ذخیرہ اس نے جمع کرلیا کہ وہ اس کو تمام عمر کی آسائش اور مسرت کے لیے کافی تھا۔ کتاب کے ذریعہ سے جو کچھ اس نے سیکھا اس کا ہزار چند استانی اصغری خانم اور مکتب کی لڑکیوں سے باتوں باتوں میں حاصل کیا۔ اب استانی جی نے اٹھ کر حسن آراء کو دیر تک گلے لگا کر پیار کیا اور آہستہ آہستہ کوئی دعا پڑھ کر حسن آراء پر دم کی اور دروازے تک ساتھ لے جا کر پالکی میں سوار کیا۔ اس طرح حسن آراء رخصت ہوئی۔

توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ نذیر احمد کا تیسرا مشہور اور دلچسپ ناول ہے۔ مذہبی رنگ کے باوجود یہ ناول اپنی ادبی خوبیوں کی بناء پر عرصہ تک داخل نصاب رہا ہے۔ اس کا موضوع تربیت اولاد ہے۔ نذیر احمد نے اس ناول میں اولاد کی پرورش، تہذیب و تربیت، اخلاق کی درستی، خیالات و متوحدات کی اصلاح کے سلسلے میں والدین اور سرپرستوں کو ذمہ دار بتایا ہے گویا اولاد کی نشوونما اور اصلاح بہت کچھ والدین کے کردار و اطوار پر منحصر ہوتی ہے اور تاوقتیکہ والدین خود کو تہذیب و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کرنے کے اہل نہیں ہوجاتے' اس وقت تک اولاد کی صحت مند تربیت ممکن نہیں۔ شروع سے آخر تک ناول ایک مخصوص دلکشی اور تاثر کے ساتھ قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو نصوح اس کو نیند میں ایک طویل خواب دکھائی دیتا ہے جس میں خود کے مرنے کا یقین ہوجاتا ہے۔ اس خواب میں حشر، اعمال نامہ، حساب قبر کی اذیتیں، دوزخ کا عذاب اور قیامت کا احوال سب کچھ بعینہٖ نظر آتا ہے۔ جب وہ جاگا تو خائف و ہراساں، بیدار ہوا تو ترساں و لرزاں۔

نصوح کو خواب کے بعد اپنے نفس کی اصلاح کے ساتھ سارے خاندان کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ اس خیال کو وہ دین کا ایک اہم فریضہ سمجھتا تھا چنانچہ اہل خانہ کے سامنے اپنی بات رکھی لیکن اس کی اصلاحی کوششوں پر خاندان کے لوگ برسر پیکار ہوجاتے ہیں اور اسے طرح طرح کی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن چوں کہ نصوص اس اصلاح پر ایمان رکھتا تھا اور خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ نصوح کا ارادہ مضبوط تھا اس لیے وہ ساری مشکلات پر غالب آتا ہے۔ چنانچہ ناول کی غرض و غایت یہ ہے کہ بچوں کی اخلاقی و دینی تربیت کے سلسلے میں

والدین استاد پر کم بھروسہ کریں اور پہلے اپنی نیک اطواری سے ان کے اعمال و کردار کو روشنی بخشیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اس ناول کو مذہب اور اصول تعلیم کی روشنی میں سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی کامیاب کوشش کہا جاسکتا ہے۔

نصوح نے اپنے خاندان کے سامنے اپنے خواب کی تفصیل رکھی کہ بیماری کی حالت میں بعد میں جو کچھ کہ خواب میں نے دیکھا معاذ اللہ! کیا حقیقت نہ بتاؤں کہ کس طرح آنکھوں کے سامنے حشر کا میدان آیا اور اللہ تعالیٰ نے کس طرح ایک ایک باتوں کا حساب لیا چنانچہ نصوح اپنے خواب کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''سب سے پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا کہ تیرا رب کون ہے؟ چوں کہ مرتے وقت مجھ کو ایمان کی تلقین کی گئی تھی، میں جواب دیا: ''اللہ وَحدہٗ لاشریکَ لہٗ''۔ تب اس پر جرح کی گئی کہ بھلا جب تو دکھن کی نوکری سے برخاست ہوکر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشیں رہا اور جو کچھ تو نوکری پر سے کما کر لایا سب صرف ہوگیا اور تو نانِ شبینہ کو محتاج ہوکر نوکری کی جستجو میں اِدھر اُدھر پھرتا تھا اور مضطرب ہوہو کر مجھ سے دعائیں مانگتا تھا۔ مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لیے تیری دعا کو التواء میں ڈالے ہوئے تھے اور ہر ایک حاکم ضلع نے بھی کہ وہ مثل تیرے ہمارا بندہ تھا ہمارے ایماء سے تیری پرورش کا وعدہ کیا مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایماء کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا۔
>
> ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت تاکید کی تھی کہ دیکھ! روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں لے جاکر بگاڑ لائے یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے دیکھ! اس کی کماحقہٗ حفاظت کیجیو

> جیسا کہ اجلا شفاف براق یہاں سے لے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اسے روسیاہ سے لایا ہے مگر پوتھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کم تر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ، بے آب، بلا رونق، خراب ہم نے تو چلتے چلتے تجھ سے کہلایا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہو جیسے سرائے میں مسافر تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو کر رہ گیا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آ کر جاگا۔"

چنانچہ نصوح نے اپنے خواب کے حوالے سے دنیا اور آخرت کے تمام تر حالات کا ایک توازن قائم کیا اور یہ نصیحت فرمائی کہ دنیا میں ہم صرف کاروبار اور دنیاوی لذتوں کے واسطے نہیں پیدا کیے گئے ہیں بلکہ آخرت کی فکر کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا نصوح نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اب ہر حالت میں اپنے خاندان کے ہر فرد کو راہ راست پر لانا ہے مگر جب غور کیا تو اندازہ ہوا کہ خاندان کے تمام لوگ مکمل طور پر دنیا میں منہمک ہیں۔ سب سے پہلے اس اصلاحی پروگرام میں نصوح نے اپنی بیوی کو شامل کیا اور اس کے ذریعہ سے اصلاح کرنی چاہی اور سب سے پہلے اپنے لڑکے سلیم کی اصلاح کا منصوبہ باندھا۔ چوں کہ سلیم دولت کی فراوانی کی وجہ سے عادتاً کافی خراب ہو چکا تھا لہٰذا باپ کی کوئی بھی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ دینی کاموں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا باپ سے بحث و مباحثہ تک نوبت آ گئی۔ اس طرح بڑی بیٹی کی عادتیں بھی بگڑی ہوئی تھیں وہ بھی باپ کی اصلاحی باتیں ماننے کو تیار نہیں ہوئی۔ نصوح سے کافی تکرار ہوئی مگر نتیجہ لاحاصل نکلا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جوانی کے ایام میں نصوح کے اندر بھی دینی جذبہ بالکل نہیں تھا، وہ خود ایک رئیس زادہ تھا۔ بچوں کی تربیت کی طرف کبھی اس نے دھیان نہیں دیا۔ اب جب کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں اور عادتیں بھی پختہ ہو گئی ہیں تو نصوح کی باتیں گراں معلوم ہوتی ہیں جس کے ماننے سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ دراصل بچوں

کو ایام طفلی سے ہی اچھی باتوں کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس ناول کا خلاصہ یہ ہے آپ بچوں کو جو کچھ سکھانا چاہتے ہیں پہلے اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایئے اس کے بعد بچے اس راہ پر چلنے کا شوق کریں گے گویا بچوں کی اچھی پرورش کے لیے والدین کا باعمل ہونا ضروری ہے۔

محصنات یا ''فسانہ مبتلا'' ڈپٹی نذیر احمد کا ایک سبق آموز ناول ہے۔ اس کا سن اشاعت ۱۸۸۵ء ہے۔ اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے ایک اہم سماجی مسئلے کو اپنے نقطۂ نظر سے عمل کرنے کی کوشش کی ہے یعنی تعدد ازدواج کی برائیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ نذیر احمد پائے کے عالم تھے۔ اپنے دینی مباحث اور معلومات سے دوسروں کا ناطقہ بند کر دیتے تھے حالاں کہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کرام کے عمل سے عقد ثانی کا ثبوت ملتا ہے اور خود قرآن نے اس کی اجازت دی ہے اور بیشتر علماء حضرات اس نازک مسئلے پر قلم اٹھانے کی جرأت کرنے لگے مگر ڈپٹی نذیر احمد ہندوستان کے لوگوں کے لیے عقد ثانی عذاب کے مترادف مانتے ہیں۔ اس مسئلے پر عارف- مبتلاء کی بحث نے مسئلے کے تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا ہے۔ مبتلاء تمام شرعی مسائل پر روشنی ڈالتا ہے مگر عارف کے سر پر ہریالی کا جادو کارگر ہو چکا ہوتا ہے اور اس کے صلح کل بیانات کی وجہ سے اس مسئلے کی شکل بدل جاتی ہے۔ غرض کہ مبتلاء کا عقد ثانی اور اس کے برے نتائج سے قاری کے دل و دماغ میں تعدد ازدواج سے بلاشبہ نفرت اور بیزاری کا احساس ہوتا ہے اور یہی ناول کی کامیابی کا راز ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا ایک اور معرکتہ الآرا ناول ''ابن الوقت'' ہے جو کہ صحیح معنوں میں ناول کی شرطوں پر پورا اترتا ہے۔ اس ناول میں طے شدہ مقصد کے تحت کوئی کردار نہیں ہے جیسا کہ نذیر احمد کے ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس میں مذہبی رنگ کی جھلک بہت کم ہے۔ یہ ناول ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ صحیح میں ڈپٹی نذیر احمد کا یہ پہلا معاشرتی ناول ہے۔

ابن الوقت ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور ذہنی طور پر انگریزوں سے بے حد متاثر، یہاں تک کہ محض انگریزوں کی خوشنودی مزاج کی خاطر اپنی مشرقی وضع قطع کو ترک کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا کہ اس طرح وہ انگریزوں کی نظر میں زیادہ محترم اور باوقار بن جائے گا جب کہ نذیر احمد کو یہ تبدیلیاں گوارہ تو تھیں مگر وہ مشرقی تہذیب کے کچھ مخصوص پہلوؤں کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر ابن الوقت کو ایام غدر میں ایک اعلیٰ انگریز عہدیدار کو پناہ دینے کا موقع مل گیا جس کی وجہ سے اس انگریز افسر سے قربت بڑھ گئی جس کے توسط سے اسے جاگیر مل گئی۔ اُدھر کچھ انگریز افسر اس بات سے جلتے تھے کہ ہندوستانی انگریزوں کی وضع نہ اختیار کریں جس کی بناء پر مسٹر شارپ ہندوستانیوں سے بہت جلتے تھے چنانچہ نوبل صاحب کے ولایت چلے جانے کے بعد اسے کافی تنگ کیا گیا۔ ہندوستانیوں کا یہ حال تھا کہ تبدیلی وضع اور انگریزوں کی خوشامد کی وجہ سے بہت سے لوگ ابن الوقت کے پیچھے پڑ گئے اور ناراض رہنے لگے اور مزید یہ ہوا کہ بعض افسر جو ابن الوقت سے ناراض رہتے تھے نوبل صاحب کی غیر موجودگی میں ابن الوقت سے مزید خفا اور ناراض رہنے لگے اور غالباً مسٹر شارپ اسی وجہ سے جلتے تھے کہ نوبل صاحب ابن الوقت کو بہت مانتے تھے اور چوں کہ ابن الوقت ایک خوشحال آدمی تھا اس لئے کہ خدمات انگلشیہ کے سلسلے میں اسے ملازمت اور جاگیر عطا کی گئی تھی مگر تمام تر کوششوں کے باوجود اس کا یہ خیال سراسر خام تھا کہ سفید فام قوم کسی طرح اسے اپنی سوسائٹی کا ایک حصہ سمجھنے لگے۔

مسٹر نوبل اور مسٹر شارپ مغرب کے مثبت و منفی رجحانات کے مظہر ہیں۔ مسٹر نوبل مغربی تہذیب کی اچھائیوں کا مجموعہ ہے، غیر متعصب اور پر خلوص ہے۔ لوگوں کے احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔ مسٹر نوبل کی اپنی تہذیب سے پیار ہے وہ ہمہ وقت کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح ان کی تہذیب فروغ پا جائے اور اس کے لئے

ہندوستانیوں کو ایک نیک نام تصور کرتے ہیں۔ جب کہ مسٹر شارپ اس کے برعکس ہے وہ ہندستانیوں کی تبدیلی وضع کا اس لئے مخالف ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہندوستانی ان کی نقل کر کے انھیں چھیڑتے اور چڑھاتے ہیں اور مسٹر شارپ کے قول کے مطابق ''ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کی کسی طرح کی آسائش نہیں ہے بے وجہ اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے''۔[1] وہ اس تبدیلی وضع کو انگریزی حکومت کو کھوکھلی کرنے کے مترادف سمجھتا ہے۔

غرض کہ ہمیں ابن الوقت میں ان تمام حالات کی بڑی خوبی سے عکاسی ملتی ہے جو سرسیدؒ کی تعلیمات کے بعد پیدا ہو چکے تھے اور متوسط طبقہ کی جہدالبقاء کو نہایت چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے۔ گو ابن الوقت ناتمام رہا مگر اس کی یہ ناتمامی کسی قسم کے احساس تشنگی کو باقی نہیں رہنے دیتی کیوں کہ اس سے جو مقصد نذیر احمد کے پیش نظر تھا وہ کما حقہٗ پورا ہو جاتا ہے اور جو تاثر وہ قاری تک پہنچانا چاہتے تھے اس میں کافی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔

مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کے نتائج کے بارے میں تجزیہ کر کے نذیر احمد نے جو نتیجہ نکالا تھا وہ قابل تحسین ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے جو تعلیم انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں کو دی جارہی ہے اس تعلیم کے حاصل کرنے کے بعد ان کے اذہان ضرور متاثر ہوں گے۔ ان کے اندر آزادیٔ افکار، جمہوریت اور اخلاق کے جو اسباق ملتے ہیں اس کے سبب وہ حکمرانوں سے ان چیزوں کے طالب ہوں گے چنانچہ ابن الوقت کے یہ الفاظ کسی صداقت کے حامل نکلے:

''آپ شاید سمجھتے ہوں گے کہاں؟ انگریز جو چاہتے ہیں کرتے ہیں
وہ زمانہ گیا شارپ صاحب کیا میری ایک متنفس کی وضع کے پیچھے پڑے

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد —— ڈپٹی نذیر احمد ص:۳۹

ہیں، ابھی تو انھیں بہت کچھ خلاف مزاج سننا اور دیکھنا ہوگا۔ وہ وقت قریب آ لگا ہے کہ اس ملک میں سول سروس کا امتحان ہوا کرے گا۔ کسی ملکی خدمات کے لئے انگریزوں کی تخصیص باقی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے۔ وائسرائے کی کونسل میں برابر کے ہندوستانی ہوں گے اور کوئی قانون بدوں ان کے صلاح ومشورہ کے جاری نہ ہو سکے گا۔ غرض انتظام ملک میں ہندوستانی ایسے ہی دخیل ہوں گے جیسے انگلستان میں وہاں کی رعایا۔'' [1]

ابن الوقت میں ڈپٹی نذیر احمد ایک بہت ہی اہم نکتہ کی طرف قاری کا ذہن مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں شریعت کے قانون کو عقل کی روشنی میں جامہ پہنانا ضروری نہیں ہے۔ جہاں تک ابن الوقت کا سوال ہے وہ خود اٹھارہ۔بیس برس کی عمر تک وہ نوافل ومستحبات کا اہتمام رکھتا تھا۔ پانچوں وقت کی جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی۔ مگر ان سب پابندیوں کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں چند شکوک ہیں۔ یہ تشکیک ہر اس انسان کے ساتھ لازمی ہوتی ہے جو اپنے دماغ سے کام لینے کا عادی ہو۔ ذہین انسان کسی چیز کو بھی اندھی تقلید اور مذہبی لیبل کی وجہ سے تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جب تک ہر نظریہ کو عقلیت کی روشنی میں نہ پرکھ لے اسے قابل قبول نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اپنی اسی فطرت کی وجہ سے وہ ہندو، جوگیوں، سنیاسیوں، اہلحدیث اور پھر بعد میں انگریز پادریوں کی طرف مرجع ہوا مگر کسی سے بھی اس کی بے چین طبیعت کو سکون نہ ملا۔ اس کی اندرونی کشمکش، تحقیق اور تفتیش کی عادت اور عقل کی رہبری نے ایک دن اسے مذہب سے کلی طور پر باغی بنا دیا۔

ابن الوقت انگریزوں میں ہر طرح سے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ آئے دن ٹی پارٹیاں اور

---

[1] مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد — ڈپٹی نذیر احمد ص:۴۲

ڈنر کا اہتمام کرتا ہے اس کے باورچی خانہ کے کھانوں کی دھوم مچی رہتی ہے، طرح طرح کے گھوڑے، کتے، عمدہ قسم کے فرنیچر وغیرہ' گویا ہر طرح سے اس نے خود کو انگریزوں کے لائق بنالیا مگر............آخر کار اس وقت بے حد صدمہ پہنچتا ہے کہ جب انگریز اپنے یہاں کوئی ٹی پارٹی کرتے ہیں تو اس کو مدعو نہیں کرتے۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ نوکروں تک سے آنکھیں چراتا ہے اور وہ اسے اپنی تذلیل سمجھتا تھا۔ آخر اس کے ذہن نے اس کو سمجھایا کہ سب کچھ چھوڑ کر ایک دوسری تہذیب اپنایا مگر وہاں بھی اسے اچھوت سمجھا گیا آخر تبدیلیٔ وضع کا وہ عزم جو ہندوستانیوں کے شور و غوغا، حجۃ الاسلام کی دلائل اور ساس کی گفتگو سے متزلزل نہ ہوسکا' انگریزوں کے سلوک سے اس میں لغزش آ جاتی ہے اور جب وہ بخار میں مبتلاء ہو کر جذباتی کیفیت میں ہندستانی کھانوں کے لیے شور مچاتا ہے تو قاری کو اس پر ترس آ ہی جاتا ہے، آخر صبح کا بھولا شام کو گھر آ ہی جاتا ہے۔ ابن الوقت کی تصنیف کا اہم مقصد یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو مغربی تہذیب و طرز معاشرت کی تقلید کے نقائص سے باز رکھا جائے کہ ہندوستانی انگریزی تہذیب کو اپنا کر خوش نہیں رہ سکتے۔

''ایامیٰ' نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع عقد بیوگاں ہے۔ ہندو سماج میں بیواؤں کی شادی منع تھی اس کے ساتھ مسلمانوں میں بھی بدعقیدگی کے طور پر یا پھر ہندو رسم و رواج کے زیر اثر یہ رسم عام عام ہوگئی کہ بیوہ کی دوسری شادی کو معیوب سمجھتے ہیں حالاں کہ اس سلسلہ میں ۱۹ر صدی کے نصف اول حصے میں راجہ رام موہن رائے نے ایک تحریک چلائی اور قانونی طور پر ہندو رسم و رواج 'ستی' کی پرتھا کو بند کروادیا۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں بھی اس کے خلاف آواز اٹھی اور ۱۸۹۵ء میں بنگلہ زبان میں اس موضوع پر ایک ناول تصنیف کیا گیا تھا اور اسی زمانے میں منشی پریم چند نے بھی اس موضوع پر اپنا ایک ناول 'بیوہ' تصنیف کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بیوہ کی تمام تر نفسیات کو اور روزمرہ کی زندگی میں آنے والی دقتوں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ناول میں آزادی بیگم کے نام سے کردار پیش کیا ہے اور کنوارہ پن سے لیکر شادی تک کی ایک عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے کہ کس طرح ایک بیوہ کی زندگی مصیبتوں سے دوچار ہوتی ہے۔ چنانچہ آزادی بیگم کا کہنا کہ:

> ''ان بیچاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔'' [1]

یہ ایک ایسی نازک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ تعدادِ ازدواج اور عقد بیوگاں کا مسئلہ غور کرنے پر احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ارشادِ ربانی ہے کہ: ''اگر تم سمجھتے ہو کہ یتیموں میں انصاف نہیں کر سکو گے تو شادی کرلو۔''

اس ناول میں نذیر احمد مسلم سماج کی اس ذہنیت کو چیلنج کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ بیواؤں کی شادی کو معیوب سمجھنے لگے تھے جو کہ ہندو رسومات کی پیداوار تھی حالاں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ اس سے ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جس طرح مسلم گھروں میں بیوہ کا وجود باعث خطرہ تھا اسی طرح ہندو گھروں میں بھی بیوہ کا وجود باعث خطرہ تھا۔ مذہب اسلام کے تمام اصول معاشرہ کو کسی نہ کسی شکل میں پاکیزہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ بیوہ کی موجودگی سے سماج میں گندگی پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے مذہب بیواؤں کی دوسری شادی کرنے پر زور دیتا ہے۔ عورتوں کی دوسری شادی پر پابندی اور مردوں کو اس سلسلے چھوٹ ملنے کی وجہ سے بیواؤں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو گیا کیوں کہ مرد دوسری اور تیسری شادی کافی عمر میں کرتا ہے اور جلدی

---

[1] نذیر احمد کے ناول (تنقیدی مطالعہ) —— ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ص:۶۱

جلدی مرکر کے اپنے پیچھے بیواؤں کو چھوڑ جاتا ہے۔ اگر بیواؤں کی شادی پر پابندی نہ ہوتو دوسری اور تیسری شادیاں کرنے کے لئے بہ آسانی اپنی عمر کی عورتیں حاصل کر سکے۔

نذیراحمد نے اس ناول میں نکاح کی بنیادی ضرورت کو لیا ہے جس کے لیے شادی ہوتی ہے یقیناً نذیراحمد کا اندازِ فکر ترقی یافتہ اور جدید معلوم ہوتا ہے اور اپنے پورے انسانی سماج کو سمیٹ لیتا ہے اس کی تہہ میں جنس کا مسئلہ کارفرما ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ تنہائی کے دیگر مسائل بھی ہیں اس بات کو نذیراحمد نے کئی موقع پر محسوس کر کے دکھایا ہے حالاں کہ آزادی بیگم کی شادی ان کی مرضی سے نہیں ہوئی تھی، ایک مولوی سے ہوئی تھی پھر بھی شادی کے بعد دونوں کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ ان کی موت کے بعد آزادی بیگم ان کو یاد کرتی ہے۔ وہ ہر بہانے سے اس کو یاد آتے ہیں۔ مولوی صاحب کچھ بھی تھے پھر بھی آزادی کی ضرورت تھے۔

نذیراحمد کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بیواؤں کی شادی کے لئے رشتے کی کمی ہے۔ وہ تمہید میں لکھتے ہیں:

> ''بے شک مردم شماری سے ثابت ہوا ہے کہ جنگلی اور وحشی قومیں چھوڑ کر ہر جگہ عورتوں کا مجموعہ مردوں سے کچھ ہی سا بڑھا ہوا ہے......... مگر نہ اتنا کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو رانڈیں ہی رانڈیں نظر آئیں۔''[1]

ڈپٹی نذیراحمد کی یہ تصنیف مکمل دلیل اور ثبوت کے ساتھ معرض وجود میں آئی ہے جیسا کہ عقد بیوگان کے مسئلے کو انھوں نے محض مذہبی نقطۂ نظر سے ہی نہیں دیکھا ہے بلکہ سماجی، معاشی ہر لحاظ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] ایامیٰ باہتمام منذراحمد طبع چہارم ص ۱

جیسا کہ ایامیٰ میں کچھ ایسی باتیں آ گئی ہیں جو دوسرے ناولوں میں اتنے واضح طور پر نہیں ملتیں۔ اس تصنیف کے اندر ڈپٹی نذیر احمد نے عورت کی نفسیات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ ایامیٰ مکمل نفسیاتی ناول ہے۔ کس طرح ایک عورت بیوہ ہونے کے باوجود جنسی میلان رکھتی ہے باوجودیکہ خواجہ مشتاق نے اس کو دھوکا دیا تھا لیکن وہ اس کی تاویل دوسرے انداز سے کرتی ہے۔ کچھ لمحوں کے لئے وہ ایسے جذبات سے محظوظ بھی ہوتی ہے۔ مشتاق کے لئے آزادی کے دل میں محبت کے جذبات ابھرتے ہیں، وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر نہیں کر پاتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی محسوس کیا ہے کہ:

"نذیر احمد ایامیٰ میں نفسیاتی تجزیہ کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔"[۱]

ڈپٹی نذیر احمد نے ایک بیوہ عورت کی ان پریشانیوں کا ذکر کیا ہے جو عموماً ایک بیوہ کو پیش آتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں مولوی صاحب کے انتقال کے بعد آزادی بیگم جس مکان میں تنہا رہتی ہے وہ اس مکان میں مولوی صاحب کی زندگی میں بھی رہتی تھی۔ جب مولوی صاحب بھوپال چلے گئے اس وقت بھی وہ اس مکان میں تنہا رہ چکی تھی لیکن وہ ویرانی سناٹا، وہ خوف اس میں رہتے ہوئے آزادی نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا اور کسی مرد نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی سنگار کرنے پر عاشقوں کے وہ نرغے ہی تھے لیکن مولوی صاحب کے انتقال کے بعد یہ کہاں سے پیدا ہو گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ان حالات کا بہترین جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے عاشقوں کے ہجوم ان کے خطوط، جملہ بازیاں اور آزادی کے گھر کے آس پاس منڈلانے کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے عاشقوں کے ہجوم اور ان کے خطوط، جملہ بازیاں اور آزادی کے گھر کے آس پاس منڈلانے کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے یہاں تک کہ

---

[۱] سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء —— سید عبداللہ ص:۳۰۸

آزادی بیگم جس چیز کو ہاتھ لگاتی تھی اس میں کسی نہ کسی عاشق کا پیغام نکل آتا تھا یعنی خط، رقعہ، نظمیں، غزلیں وغیرہ۔ نذیر احمد صاحب ایک سوال کرتے ہیں کہ آخر سبب کیا تھا وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے یہ معاملات سامنے آرہے ہیں؟ دراصل وہ آزادی کی بیوگی کی کمزوری تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔ آزادی خود بھی اس کے اسباب پر غور کرتی ہے:

> ''اگر میں واقعی خوبصورت ہوں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں تو خوبصورتی تو کچھ زنڈاپے سے نہیں آتی مگر لوگ جانتے تھے کہ ایک کے نکاح میں ہے اس سے کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ اب دیکھا کہ اس کا کوئی سرپرست نہیں لگے عاشقی کا دم بھرنے تو اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں اگر ہے تو میرا ہے۔ آج میں کسی کی ہوجاؤں تو عاشقی معشوقی سب کا خاتمہ ہے۔'' [1]

نذیر احمد نے ایک بیوہ کی نفسیات کا جائزہ اس طرح بھی لیا ہے کہ لوگ اپنی جنسی آسودگی کے لیے جانور پال لیتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اس سے بہل جاتے ہیں جیسے طوطا مینا پالنے کے بارے میں آزادی بھی سوچتی ہے لیکن آزادی کے جذبات شعور کی سطح پر تھے لاشعور کی چیز نہ بن سکے تھے اس لیے وہ ان مشغلوں سے نہیں بہل سکتی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی باہری وجہ سے جذبات لاشعور میں چلے جات ہیں اور لوگ طوطا مینا وغیرہ پالنے کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔ آزادی بھی ان جانوروں کو پال کر بہل سکتی تھی اگر کنواری ہوتی۔ لیکن بیواؤں کا اس طرح بہلنا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کے اسرار و رموز سے واقف ہوتی ہے۔ آخر کار آزادی اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس کے مرض کا علاج صرف موت ہے لیکن خودکشی گناہ عظیم ہے اس لیے وہ خودکشی بھی نہیں کرسکتی۔

1۔ ایامیٰ طبع چہارم ص ۱۴۳-۱۴۴

آزادی ایک ایسا کردار ہے جو ناول کے آخر تک سوچتا ہے اور سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہزاروں لاکھوں بیوائیں سوچتی ہیں۔

نذیر احمد کے اس ناول کا اثر یہ ہوا کہ اس کی تصنیف کے بعد دہلی میں بے شمار بیواؤں کی شادیاں ہوئیں۔

اس طرح نذیر احمد کا بالکل نیا نسوانی کردار ہے۔ انھوں نے مرد عورت کے رشتوں کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ ان کا تجزیہ ہے کہ دل بدلتا رہتا ہے۔ اگر اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو تو نہ جانے کتنے مجنوں اور فرہاد پیدا ہوں۔ مغرب میں اس قسم کے کردار مفقود ہیں اور آج محبت و ہوس میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے۔ نذیر احمد نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو اپنے قصے کا موضوع بنایا۔ مخالف جنس کے آپسی اختلاط و ارتباط کے روزانہ زندگی میں جتنے فطری انداز ہو سکتے ہیں انھوں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔

ایک بیوہ کی زندگی کو ۱۸۹۱ء میں نذیر احمد نے جس انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے آج تک شاید ہی کسی نے دیکھا ہو یقیناً یہ ان کے لیے فخر کی بات ہے۔

ناول نگاری کے تسلسل میں رویائے صادقہ نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے عین مطابق ہے اس میں شک و شبہات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ [1]

رویائے صادقہ کا موضوع خالص مذہبی ہے۔ نذیر احمد کی مذہب سے دلچسپی یہاں نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ یہ ناول دینیات کا ایک رسالہ معلوم ہوتا ہے۔ نذیر احمد اس ناول کو ایم۔او

---

[1] روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۴ء — لکچر نذیر احمد ص: ۳۲

کالج کے دینیات کے نصاب میں داخل کرانا چاہتے تھے اگرچہ یہ نصاب میں شامل تو نہیں ہوسکا لیکن طلباء کی اکثریت اس سے دینی مسائل کو حل کرنے کے لیے چراغ راہ کا کام لیتی تھی۔ اس ناول میں مسلمانوں سے واضح الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ وہ مناظرہ فطرت چھوڑ کر اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں اور وہ جہادی مسلمان نہ بنیں بلکہ اجتہاد مسلمان بنیں۔[1]

یہ ناول مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور نظریات کو مٹانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں مذہبی مباحثے کا بیحد رواج تھا، باہم آپسی جھگڑے پیدا ہوجاتے تھے، بحث و مباحثے میں مسلمانوں کا کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ انھیں تمام خرابیوں کے سدباب کے لیے نذیر احمد نے اس ناول کو لکھا۔ ویسے مذہب بھی دنیائے ادب عالیہ کا موضوع رہا ہے۔ انگلش میں جارج ایلیٹ کے ناول اعلیٰ مقام رکھتے ہیں' ان کا موضوع بھی مذہب اور فلسفہ ہی رہا ہے۔

اس ناول میں مغربی معاشرت کے خلاف ایک خاموش کشمکش جاری رہتی ہے جیسا کہ ابن الوقت میں' اس ناول میں خواب کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ صادقہ کو خواب میں جو پیر طریقت نظر آتے ہیں وہ خود نذیر احمد ہی ہیں جو ایک بزرگ کی شکل میں نظر آتے ہیں اور اپنا تعارف اور گذشتہ واردات قلب اور افکار ذہنی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

صادقہ کی باتوں سے ایک ایسی لڑکی کے ذہن کی عکاسی ہوتی ہے جس کی شادی میں بہت دیر ہوچکی ہے خصوصاً صادقہ اور اس کی سہیلی ہمراز کی گفتگو ان کے عمیق مشاہدہ کی غماز ہے۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد اُردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ایک جامع حیثیات تھے۔ اُردو زبان و ادب کی دنیا میں ان کی شہرت صرف ناول نگاری کی وجہ سے ہی

---

[1] رویائے صادقہ 'دیباچہ' ص:۴

نہیں ہے بلکہ ان کے تراجم اور دیگر مذہبی تصنیفات نے ان کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ بعض ناقدین ادب تو ان کے تراجم اور مذہبی تصنیفات کو ان کی اولیت میں شمار کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ناول کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر تصنیفات کے متعلق بھی ضرور بحث ہونی چاہیے۔

غیر معیاری تصنیفات پیش کرنے سے کہیں زیادہ فائدہ مند بات یہ ہے کہ دوسری زبانوں سے اعلیٰ اور معیاری چیزوں کا ترجمہ ہی کیا جائے۔ کسی کتاب کا مصنف تو ایک زبان سے کام چلا سکتا ہے مگر ایک مترجم کو دو زبانوں کا جاننا ضروری ہے' ایک تو وہ زبان سے جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور دوسری ترجمہ کی زبان۔ مزید زبانوں کی جانکاری ترجمہ کو عمدہ بنانے میں معاون ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مترجم کو مقامی زبانوں کے اثرات سے باخبر رہنا ضروری ہے اور تصنیف کے مواد سے واقفیت ضروری ہے جیسے ایک سائنس کی کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے تو اس کو سائنس کا علم ہونا ضروری ہے اور شعری تصنیفات کے مترجم کو شعریات سے شغف ہونا چاہیے۔ ایک ایسا مترجم جو شعر و شاعری کا ذوق نہ رکھتا ہو ان الفاظ کے جذباتی اور تخلیقی عمل کے شعور سے جن کو شاعر نے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے' بیگانہ ہوگا اور اس کے ترجمے میں وہ شعریت نہ ہوگی جو شاعر کے یہاں ملتی ہے۔

نذیر احمد نے بھی اپنا ادبی سفر ترجمہ سے شروع کیا ہے۔ دہلی کالج سے تو وہ براہ راست وابستہ تھے۔ سیدہ جعفر کی ایک تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے سب سے پہلے جو ترجمہ پیش کیا وہ ہے ماسٹر رام چندر کی ایک انگریزی کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ۔ وہ کہتی ہیں:

> ''چنانچہ نذیر احمد نے رام چندر کی خاطر ان کی فرمائش پر اس انگریزی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ کیا تھا۔ رام چندر اسلام کی تردید میں

لکھ رہے تھے اس پر دلّی والوں نے بڑا شور مچایا تھا یہاں تک کہ مولوی
عبدالقادر نذیر احمد کے لیے کفر کا فتویٰ لے آئے تھے۔'' [1]

لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ماسٹر رام چندر کی یہ تصنیف بعد کی ہے
گارسن وتاسی کا قول ہے:

''اعتراض القرآن میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے۔
شورش عظیم سے قبل رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔'' [2]

گارسن دتاسی نے یہ تبصرہ ۱۸۷۰ء میں کیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر کی یہ تصنیف بہت بعد کی ہے۔اگر ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مطلب اسی تصنیف کے ایک باب کے ترجمے سے ہے تو اس کا ترجمہ بہت بعد میں ہوا،اس وقت نذیر احمد نے اچھی خاصی انگریزی سیکھ لی تھی۔

نذیر احمد نے سب سے پہلے انگریزی کی ایک قانون کی کتاب ''انکم ٹیکس ایکٹ'' کا ترجمہ کیا۔انکم ٹیکس ایکٹ اول بار جاری ہوا تھا۔سر ولیم میور جو ان دنوں سنیئر ممبر آف رونیو بورڈ تھے' اس کا ایک اُردو ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔اس کے لیے انھوں نے ناصر علی خاں ذوالقدر ڈپٹی کلکٹر اول کی خدمات طلب کیں لیکن انھوں نے اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کرنے کے ساتھ ہی نذیر احمد کا نام بھی پیش کر دیا۔

نذیر احمد کا پہلا اہم ترجمہ ہے 'ترجمہ پینل کوڈ'۔یہ ایک بہت ہی اہم قانون کی کتاب ہے۔اس میں انگریزی سے اُردو ترجمہ اور اصلاح سازی دونوں کام کے لیے ملکہ کی ضرورت تھی یہ کام بہت ہی نازک تھا۔قانونی کتابوں کے ترجمے کے لیے مترجم کے اندر قوت فیصلہ،استواری اور

[1] ماسٹر رام چندر مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص:۶۱
[2] گارسن وتاسی کا مقالہ نمبر ۷۷ بحوالہ قدیم دہلی کالج نمبر ص:۱۲۱

گہری اور عمدہ سوجھ بوجھ کی اور بھی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ انھیں ترجموں پر کتنی بیش بہا زندگیوں کا انحصار ہوتا ہے۔ ذرا سے غلط ترجمے سے قانونی دفعات یکسر بدل کر اس کی ضد بھی ہوسکتی ہے اس لیے اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ قانونی ترجمہ کس قدر اہم ہوتا ہے۔

اعظم گڈھ کے دوران قیام انھوں نے ایک اور بہت ہی اہم ترجمہ کیا جو سمٰوات کے نام سے مشہور ہوا جو کہ انگریزی کی ایک علم ہیئت کی کتاب سے کیا گیا تھا۔ نذیر احمد کے اس ترجمہ کی اہمیت قانونی ترجموں سے الگ نوعیت کی ہے۔ یہ نذیر احمد کا ایک علمی ترجمہ ہے۔ اس ترجمے سے نذیر احمد ایک مترجم کی حیثیت سے علمی حلقوں میں روشناس ہو گئے۔ اس ترجمہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نذیر احمد کی مہارت ترجمے کے سلسلے میں کافی بڑھ چکی تھی۔ حیات النذیر سے اس کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں:

''بھلا اگر تم سے کوئی یہ سوالات پوچھ بیٹھے۔

۱- آسمان کیا چیز ہے۔

۲- اور یہ جو ظاہر میں ایک سمندر سا امنڈا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کے کنارے کا نام ونشان اس کی تھاہ کا پتہ ٹھکانہ تم بتاؤ۔

۳- وہ تو کچھ عقل انسانی کے لیے ایک شرف مقدر تھا کہ سب علوم میں پہلے علم ہیات ایجاد ہو گیا ورنہ یہ وہ چوٹی کے مسئلے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں ایجاد کا مادہ کتنا ہی کیوں نہ ہو بے مدد علم ہیاۃ ان کو حل کرنے کا ارادہ کیا وہ سری۔'' [1]

نذیر احمد کو اس ترجمے میں علمی اصطلاحات وضع کرنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے ہیں۔ اس

[1] حیات النذیر ص:۶۸-۶۹

ترجمے کی اصطلاحیں بھی نذیر احمد کی زبان کی پختگی، استواری اور اہلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ان اصطلاحات میں سے چند یہاں دی جاتی ہیں۔

> ''سلطان خاور، نقاط روشن، عالم تاریکی، قدرتی چراغ، کرات معلقہ، قوت نظری، فراخی عالم، پیچ دار حرکتوں، جہان مرئی، اصول استنباط، اجرام فلکی، آیات آسمانی، متعدل موسم، کہکشاں، نظام شمسی، رصد گاہ وغیرہ۔'' [1]

چونکہ نذیر احمد اس ترجمے سے اُردو زبان میں بہت سے نئے الفاظ کا اضافہ کیا اور علمی مضامین کے بیان کی صلاحیت کو بڑھایا' اس حیثیت سے نذیر احمد کا یہ کارنامہ بہت ہی گرانقدر ہے۔ سمٰوات کا ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔

علمی اور قانونی تصانیف کے علاوہ نذیر احمد نے افسانوی تصنیفوں کا بھی ترجمہ کیا جس کا جائزہ اس اعتبار سے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اُردو زبان کو واقعات بیان کرنے میں کافی مدد ملی اور جدید طریقے ہاتھ آئے۔

اُردو زبان کو سنوارنے میں اور اس کے دامن وسیع کرنے میں نذیر احمد نے ہمہ جہت کوشش کی۔ انھوں نے ہر موقع پر الگ الگ زبان و بیان کا اسلوب بیان کیا ہے جس سے کہ مضمون میں تاثیر پیدا ہو اور مضمون دلنشیں ہو جائے۔ جیسا کہ انھوں نے غالبؔ کے خطوط' باغ و بہار سے تو اثر لیا ہی ہے انھوں نے سماج و معاشرت سے بھی اپنی زبان کی تشکیل میں بہت مدد لی ہے۔ زبان و بیان کی پختگی کو بنانے کے لیے انھوں نے اپنی کتاب منتخب الحکایات میں سادہ زبان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مشکل الفاظ کا قصداً استعمال کیا ہے تا کہ بچے اُردو کے کچھ مشکل

---

[1] حیات النذیر ص:۶۸-۷۱

الفاظ سے روشناس ہو جائیں۔ اس کو نذیر احمد کے افسانوی ترجمہ میں شمار کر سکتے ہیں جو کہ انگریزی حکایتوں کا ترجمہ ہے۔ اپنی بات کو بچوں تک پہنچانے کے لیے اور قارئین کے مزاج کا خیال کرتے ہوئے اس میں طنز سے زیادہ مزاح کا سہارا لیا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس سے بچوں کو اور ان کے ساتھ ان کے والدین کو بھی ہنسنے کے مواقع اکثر نصیب ہوتے رہے ہیں اور گھر میں اس کے مطالعہ سے ایک خوشگوار فضا پیدا ہو جائے۔ حکایتوں کو حتی الامکان اخلاص کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش ملتی ہے تا کہ بچے تھوڑہ پڑھیں اور زیادہ لطف لیں۔ اس سے ان بچوں کی نفسیات سے آگہی کا احساس ہوتا ہے۔

مبادی الحکمت میں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں سے خیالات اخذ کیے ہیں۔ یہ رسالہ دونوں زبانوں سے اخذ کرنے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں نذیر احمد نے انگریزی کے ایک رسالہ سے بھی مدد لی ہے جس کو ایم۔ کیمپسن صاحب نے دیا تھا جو کہ بقول نذیر احمد اس کتاب میں قطبی اور اس سے فروتر عربی زبان کی منطق کی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔[1] ان دونوں زبانوں کی کتابوں کے سہارے نذیر احمد نے اپنی سلیس شگفتہ نثر میں اُردو زبان میں منطق کی ایک عمدہ ابتدائی تصنیف کا اضافہ کیا۔ سر ولیم میور اور کیمسن صاحب نے اس کو بے حد پسند کیا اور نصاب میں داخل کیا۔ یہ کتاب گورکھپور کے دورانِ قیام ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔

حیدر آباد کی ملازمت کے دوران نذیر احمد نے سات آٹھ چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسائل تحریر کیے تھے جن کے اندر اعمال کے لئے ہدایتیں اور شہزادے لائق علی کے لیے جو بعد میں حیدر آباد حکومت کے سربراہ ہوئے تعلیمی نصاب تھا جس کو نذیر احمد نے بڑی جانفشانی سے تیار کیا

---

[1] مبادی الحکمت ص:۱۵

تھا۔ سر سالار جنگ اول نے اس کو اتنا پسند کیا کہ آئندہ پنشن میں ڈیڑھ دو سو روپیے ماہوار کا اضافہ کیا اور انھوں نے خود بھی اس کو پڑھی دلچسپی سے پڑھا۔ کچھ سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ان رسالوں کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے علاوہ لکچروں میں استعمال کیے گئے انگریزی اصطلاحی الفاظ کے ترجمے جو انھیں کے سامنے قوسین میں دیئے ہوئے ہیں اگر انھیں کے کیے ہوئے ہیں تو یہ ترجمہ شدہ الفاظ کی اس صلاحیت کی انتہا کہے جاسکتے ہیں اور تعزیرات ہند کی اصطلاحوں سے زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ان کی صلاحیتوں کی ترقی پذیری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اصلاحی مشن کے لیے جہاں بہت سارے معاشرتی ناول لکھے، سماج کے اندر جو کچھ انھوں نے کمیاں یا خامیاں محسوس کی ان سب کو اپنی ناول نگاری میں جگہ دی۔ اس اصلاحی مشن کے لیے انھوں نے بہت سارے تمثیلی قصے، طبع زاد مضامین لکھے وہیں پر انھوں نے مذہب کا سہارا لے کر مختلف کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی مذہبی کتابوں میں خاص طور پر دو مذہبی کتابیں قابل ذکر ہیں: ایک ترجمہ قرآن دوسری الحقوق والفرائض۔ اس کے علاوہ امہات الامہ بھی مذہبی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ادعیۃ القرآن، مطالب القرآن، الاجتہاد، دہ سورہ وغیرہ بھی ان کی چھوٹی اور بڑی کئی مذہبی کتابیں ہیں لیکن یہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ امہات الامہ اور الاجتہاد کو چھوڑ کر دوسری دینی کتابوں کی تیاری میں قرآن شریف کے ترجمے سے کافی مدد لی گئی ہے۔

نذیر احمد نے اپنی تمام مذہبی کتابوں کی تصنیف اپنی عمر کے آخری حصے میں کی جب کہ ان کا فن شعور مذاق سب پختہ ہو چکا تھا۔ ناول اور دیگر تصنیفات کی وجہ ان کو شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کے مذہبی خیالات اور معتقدات کے عادی ہو چکے تھے اور پھر ان کی تقریروں اور لکچروں کی وجہ سے ان کو

کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ عوامی حلقہ میں ان کی پذیرائی ہو چکی تھی۔ اب ایسے میں اگر کوئی بات کہیں گے تو عوام ان کی باتوں کو قبول کریں گے۔ اس طرح مذہبی خیالات اور معتقدات کے براہ راست اظہار کے لیے کافی حد تک زمین ہموار ہو چکی تھی اب قوم کے ذہنی آپریشن کے لیے مواد تیار ہو چکا تھا اس لیے نذیر احمد ہر کام کو چھوڑ کر مذہبی کتابوں کی تیاری میں لگ گئے۔

قرآن شریف کے ترجمے کے کام کو نذیر احمد کا سب سے بڑا کارنامہ مانتے ہیں حالاں کہ اس ترجمہ کے کام کرنے سے پہلے نذیر احمد اس کام کے ہی خلاف تھے۔ اس کی دو وجہیں تھیں اول تو تحریف تھی جیسا کہ توریت کے ترجمہ میں ہوا۔ قرآن شریف میں ایک جگہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آمد ہوگی مگر توریت اس بشارت سے خالی ہے۔ اس کی وجہ کثرت ترجمہ ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ توریت میں تحریف کر دی گئی ہے کہ خود ان کا مذہب خطرے میں پڑ جاتا۔ دوسرے وہ ترجمہ کے کام سے اس لیے بھی بچتے تھے کہ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا ترجمہ اصل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگر میں دی ہوئی باتوں کو اُردو کے قالب میں ڈھال بھی لیا جائے تو فصاحت و بلاغت کا ترجمہ کیسے کیا جائے گا۔ یہی پریشانی نذیر احمد کے کام میں مانع تھی۔

قوم کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہی ہے اور قرآن فہمی کے لیے عربی زبان کا جاننا از حد ضروری ہے، بغیر عربی کے جانکاری کے کوئی قرآن سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے وہ عربی سیکھنے پر زور دیتے تھے، وہ عربی دانی کو شرط مسلمان کہتے تھے لیکن قوم کی اس زبان کی طرف سے لاپرواہی کی وجہ سے وہ مایوس تھے۔ اس کی اسی مایوسی کے بطن سے قرآن شریف کے ترجے کا خیال جنم لیا تھا۔

اس کے علاوہ ان کے بعض احباب نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں

بشیر الدین اٹاوی کا قول ہے کہ دہلی کانفرنس میں ۱۸۹۲ء میں سب سے پہلے میں نے اس کار خیر کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں کچھ نا اہل جن کو عربی زبان تک کی واقفیت نہیں تھی وہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کو سامنے رکھ کر بامحاورہ سلیس اُردو زبان میں ترجمے کا کام پیشے کے طور پر کرنے لگے تھے اور چوں کہ عربی سے نابلد تھے اس لیے ترجمے میں وہ بات بھی لاتے تھے جو قرآن میں ہے ہی نہیں۔ اس طرح سے لوگوں کے عقیدے میں خرابی آ رہی تھی اور اسلام کا خراب تاثر لوگوں تک پہنچ رہا تھا۔ لہٰذا اصلاح کے طور پر بھی نذیر احمد نے اس کام کو انجام دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ صحیح اور اچھا ترجمہ پہنچنا چاہئے ورنہ اس سے بڑی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے خیالات ترجمہ کے کام کے محرک بنے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ لوگوں کے عقیدے کی اصلاح کے طور پر بھی قرآن کے ترجمے کی ذمہ داری اٹھائی اور ترجمے کے اندر ادبی زبان کا مکمل لحاظ رکھا جیسا کہ ڈاکٹر محمد عزیز علیگڑھ میگزین ۱۹۶۱ء میں اس ترجمہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے کی (مذہبی) پہلی کتاب ان کا ترجمۃ القرآن ہے۔ کہنے کو تو یہ قرآن کا ترجمہ ہے مگر درحقیقت اُردو ادب کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔'' [۱]

ایک دوسرے موقع پر اس ترجمے سے متعلق رام بابو سکسینہ اُردو ادب کی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اُردو کا ترجمۃ القرآن ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو بڑا

۱؎ علیگڑھ میگزین ۱۹۶۱ء ص:۲۹

فائدہ پہنچا جو قرآن شریف کو ازبر بلا معنی سمجھے یاد کرلیا کرتے تھے۔اس سے پیشتر جس قدر ترجمے قرآن شریف کے ہوئے تھے ان کی زبان قدیم تھی، اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا اس لیے مقبول عام نہ ہو سکا۔ مولانا نے چار عالموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت اور جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا۔ مگر اس میں اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اُردو الفاظ و محاورات کے بیجا تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح، اضافہ اور تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا، ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔"[1]

عوام الناس کی آسانی اور اصلاح کے طور پر انھوں نے قرآن شریف کے ترجمہ کے پہلے چند صفحوں میں مختلف موضوعات کے مطابق ابواب قائم کیے ہیں اور اس کے سامنے آیات کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔اس سے قاری دنیاوی اور دینوی امور سے متعلق جس موضوع پر قرآن شریف کے ارشادات چاہے مع ترجمہ کے آسانی کے ساتھ پا سکتا ہے مگر ترجمۃ القرآن میں مختلف موضوعات کو یکجا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔مترجم کو ناچار اسی تسلسل سے چلنا ضروری تھا جس میں آیات کی ترتیب قرآن شریف میں ملتی ہے۔یہاں ترجمہ مقدم ہے موضوعات کو ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔

مترجم نے موضوعات کے مطابق اہم آیات کو یکجا کرنے کا کام اپنی ایک دوسری تصنیف میں کیا ہے جس میں امور قرآنی کو مستند احادیث کے ساتھ مختلف عنوانات سے علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کر کے ترتیب دیا ہے اور اس کے آگے اس کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔نذیر احمد

---

[1] اُردو ادب کی تاریخ ص:۵۸

کی اس اہم مذہبی تصنیف کا نام ''الحقوق والفرائض'' ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے کا نام حقوق اللہ، دوسرے کا نام حقوق العباد اور تیسرے میں دنیاوی اور دینوی معاملات اور اشیاء کے آداب سے بحث کی گئی ہے۔

اس تصنیف کی بنیادی حیثیت پر غور کیا جائے تو یہ بھی ایک طرح کا ترجمہ کا کام ہے کیوں کہ قرآن کے ترجموں اور احادیث کے ترجموں سے فائدہ اٹھا کر اس قیمتی مجموعہ کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تصنیف کو ایک اور زاویہ سے دیکھا جاسکتا ہے یہ زاویہ نگاہ اس کو ایک قانونی تصنیف کی حیثیت عطا کرسکتا ہے۔ اس میں اسلامی قوانین بیان کیے گئے ہیں اس سے ''مسلم لا'' طالب علم بھی خواطر خواہ استفادہ کرسکتا ہے اور اس میں اس کو شادی، طلاق وراثت، مہر اور حقوق زوجین وغیرہ اہم معاملات کے بارے میں مسلم قوانین مل سکتے ہیں۔ اس لیے مسلم قوانین کی واقفیت کی غرض سے بھی اس تصنیف کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن اور احادیث فہمی کے لیے نیز ان سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ترجمۃ القرآن یہ بتاتا ہے کہ قرآن مجید نے اسلام کا کیا نقشہ پیش کیا ہے لیکن ''الحقوق الفرائض'' قرآن مجید کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور بہت سے ایسے مسائل کو بھی پیش کرتا ہے جن پر قرآن خاموش ہے یا جن پر صرف مبہم اشارے ملتے ہیں۔

نذیر احمد نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم سے متعلق اپنے ایک لکچر میں اسلامی نصاب سے بحث کی ہے اور اپنے طور پر ایک ایسے نصاب کا خاکہ بھی پیش کیا ہے جس پر اسلامی نصاب کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ نذیر احمد نے قرآن کو دستور العمل مانا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے علوم مذہبی ہیں سب قرآن کے تابع ہیں اور احادیث قرآن کی سب سے بہتر، سب سے جامع اور سب سے مناسب

تفسیریں ہیں۔اس کے بعد آثار صحابہ،تابعین پھر تبع تابعین سے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ان تمام چیزوں سے مل کر فقہ کا علم وجود میں آتا ہے جس کے متعلق نذیر احمد خود اس طرح لکھتے ہیں:

''اور یوں قرآن واحادیث اور آثار واجتہاد سب کا ایک مجموعہ مدون ہو جس کا نام فقہ ہے۔'' [1]

ایک نئے علم سے قرآن فہمی میں مدد ملنی چاہیے تھی لیکن اس کے برعکس یہ علم اپنے مقصد سے دور ہوتا گیا اور یہ خود ہی ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ گیا ہے جس سے مسلمان قرآن اور اس کی سچی تعلیم سے دور ہوتا چلا گیا۔نذیر احمد احادیث کو مذہبی تاریخ سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی تحقیق و ترتیب کو ایک بہت بڑا مذہبی کارنامہ سمجھتے ہیں اور ان کی ترتیب کو تاریخی چھان بین کی بہت عمدہ مثال بھی تصور کرتے ہیں۔مگر مذہبی تعلیم کی درس و تدریس کا طریقہ اتنا ناقص تھا کہ قرآن فہمی میں اس سے مدد ملنے کی جگہ اور دشواری پیدا ہو گئی۔اس خیال کی صراحت کے لیے انھوں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''غرض ہمارا تعلیمی کورس بنایا تو گیا قرآن کو سمجھانے کے لیے مگر ہم اسی کورس میں الجھے رہے اور کورس کی الجھن نے قرآن کے سمجھنے کی نوبت نہ آنے دی۔کورس کا بجائے خود ایک انبار تھا اسی کا ڈھونڈنا ہم کو بھاری پڑ گیا اور نتیجہ یہ ہوا اور ہونا ہی تھا کہ قرآن نے جو ولولے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیے تھے وہ ٹھنڈے پڑتے پڑتے صرف نام کے مسلمان رہ گئے۔'' [2]

نذیر احمد کی آخری مکمل تصنیف ''امہات الامہ'' ہے۔یہ ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔اس کتاب کو نذیر احمد نے ایک عیسائی احمد شاہ شائق کی اہانت آمیز تصنیف ''امہات المومنین''

---

[1] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص:۳۶۷

[2] لکچروں کا مجموعہ جلد دوم ص ۳۶۷

کے جواب میں تصنیف فرمائی تھی۔مصنف نے رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر تکثیر از دواج کو لے کر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی۔نذیر احمد نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تکثیر از دواج بھی منشائے ایزدی ہی تھی، اس میں بھی اسلام کی بہتری پوشیدہ تھی۔احمد شاہ شائق کی تصنیف کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔عام مسلمانوں نے بھی غم وغصہ کا بہت ہی زور و شور سے اظہار کیا، جگہ جگہ استغاثہ فوجداری کی تیاریاں کرنے لگے۔دلی کے کچھ لوگ فریاد لے کر شملہ گئے بارے پادری صاحب کی کتاب کی اشاعت حکماً بند کر دی گئی۔ [1]

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف میں کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو ضرور ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ عربی اور اُردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں زبان بہت زیادہ سطحی ہو جاتی ہے اور پھر مولانا صاحب محاورے اور تمثیل کے بہت ہی قائل تھے اور زبان کا ملکہ ہونے کی وجہ سے صحیح وغلط کی پرواہ کیے بغیر لکھتے جاتے تھے نتیجتاً کہیں کہیں بہت ہی عامیانہ زبان استعمال کر جاتے تھے۔ان سب کے باوجود علامہ راشد الخیری نے اس کتاب کے متعلق اپنا خیال اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

> "...........کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کو ثابت کر جائے اور مسلمانوں کے لیے اتنا لٹریچر مہیا کر دے جو امہات الامہ میں ہے۔" [2]

اس طرح وحید الدین سلیم بھی امہات الامہ کی بعض اہم حیثیتوں کے قائل نظر آتے ہیں۔وہ مضامین سلیم میں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] عصمت دہلی ۱۹۱۲ء بحوالہ حیات النذیر ص ۶۱۲

[2] بحوالہ دیباچہ امہات الامہ ۱۹۳۵ء ص ۴

''مولانا کو اس کا بھی یقین تھا کہ جو کچھ اپنوں نے لکھا تھا مذہباً اور تاریخاً صحیح ہے۔'' ۱

اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بالواسطہ طور پر سلیم صاحب بھی اس تصنیف کو مذکورہ بالا حیثیتوں سے صحیح خیال کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس تصنیف سے اُردو زبان میں بے لاگ مذہبی تاریخ نویسی کی بنیاد پڑتی ہے جو علامہ شبلی نعمانی کی سیرت نگاری سے الگ ایک اور ہی تقاضہ کرتی ہے۔

دراصل اس کتاب کی تصنیف کا مقصد نذیر احمد کے یہاں مسلمانوں کی اصلاح سے نہیں تھا بلکہ یہ تصنیف غیر مسلموں کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ اس کی جگہ انگریزی دانوں کے یہاں تھی جو جدید تحقیق سے مانوس تھے جس کے ذریعہ سے وہ اس کے ظاہر سے گمراہ نہ ہو کر اس کی معنویت کو جگہ دیتے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکتے۔ یہاں مصلحت سے زیادہ حقیقت درکار تھی۔ یہاں دوسروں کے عیوب گنانے سے کام چلنے والا نہیں تھا بلکہ اپنے اوپر عائد کیے گئے فرد جرم کی جوابدہی کرنی تھی۔ کسی کے الزام کے بدلے الزام لگا دینے سے اپنا جرم ختم نہیں ہو جاتا۔ یہاں اپنے اوپر لگائے گئے الزم کو غلط ثابت کرنا تھا۔ یہ انداز مذہبی تحقیق کے بالکل جدید رجحان پر مبنی تھا۔ یہاں عقائد و ایمان سے کام چلنے والا نہیں تھا بلکہ خالص سائنسی انداز میں عقل کی سطح پر سوچنے کی ضرورت تھی۔ یہی نذیر احمد نے کیا بھی۔ امہات الامہ کے ہنگامے پر مولوی عبدالحق کا غم و غصہ کا اظہار کسی تعصب سے زیادہ اُردو زبان کے ایک پر خلوص خادم کی بیجا تذلیل کی وجہ سے بھی تھا۔

''اجتہاد'' نذیر احمد کی ایک اہم مذہبی تصنیف ہے اس کو انھوں نے ۱۹۰۸ء میں تصنیف کیا

۱؎ مضامین سلیم ص ۱۵۸

تھا۔نذیر احمد اپنی اس تصنیف کے متعلق مطالب القرآن کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ:

''بیشک اکثر مذہب کا اصل وضع میں یہی حال اور پیروؤں کی بعد کی بڑھائی ہوئی پابندیاں علیحدہ' مگر اسلام میں تو اصل وضع میں مرادف آزادی ہے۔اس میں جو کچھ پابندیاں ہیں ان سے وہ جو اصل وضع ہیں۔چوں کہ سرتاسر مطابق فطرتاً ہیں اور ان کے مطابق فطرتاً ہونا ہم نے بشرح بط اپنی کتاب اجتہاد میں ثابت کر دیا ہے۔'' [1]

دراصل نذیر احمد کی پوری کوشش اسلام کو ایک دین فطرت ثابت کرنے کی رہی ہے۔ نذیر احمد کی اس تصنیف کو علم الکلام کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے اس میں اسلامی عقائد اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس تصنیف میں وجود باری تعالیٰ، توحید، شرک، رسالت، پیغمبر اسلام کی صداقت، نزول قرآن کی اصلی غرض دیگر مذاہب کا اسلام سے مقابلہ، دین اور دنیا کا ایک دوسرے سے تعلق کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ان موضوعات پر نذیر احمد کا ذہن اکثر سوچتا رہتا تھا۔انھیں خیالات کو سوال و جواب کی شکل میں اس تصنیف میں قلم بند کیا گیا۔نذیر احمد خود کہتے تھے کہ وہ اجتہادی مسلمان ہیں۔ انھوں نے مذہب کو سمجھ کر اپنایا ہے۔یہاں اپنے انھیں تمام افکار کو انھوں نے اسیر تحریر کر لیا ہے۔وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھ کو خیال آیا کہ میں کیوں مسلمان ہوں۔ خیالات کا تو یہ حال ہے کہ اِدھر اور اُدھر غائب، طبیعت دوسری طرف متوجہ ہو گئی مگر یہ خیال کہ میں کیوں مسلمان ہوں کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند ٹالنا

---

[1] مطالب القرآن ص ٦

چاہتا تھا ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا یہاں تک کہ کئی سال متواتر میں اسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہا۔ خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک مگر ایسا معلوم ہوا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں ایک حیثیت سے سائل اور ایک حیثیت سے مجیب۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا خیال کسی دوسرے مسلمانوں کو آتا ہے کہ نہیں مگر آنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی ضرورت سمجھ کر خاص مذہب کا معتقد ہے کبھی کبھی اپنے نفس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کیوں مبتلائے ہندو یا عیسائی یا یہودی یا پارسی یا کیا کیا ہے۔ ایسا خیال کرنے سے قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کرے گا............تاہم وہ حق سعی بجالایا اور اس کے لیے وہی حق ہے جو اس نے سمجھا۔" [1]

مطالب القرآن نذیر احمد کی آخری نامکمل تصنیف بتائی جاتی ہے۔ نذیر احمد کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ لوگ قرآن شریف کو مکمل طور پر سمجھ کر پڑھیں اور خود کی اصلاح کریں۔ قرآن شریف میں باری تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے مسلمان اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔ وہ قرآن شریف مکمل اُردو زبان میں پیش کرنا چاہتے تھے مگر اپنے دور کے کچھ مولویوں کی قدامت پسندی سے ڈرتے تھے اور مصلحتاً اس کام کو ملتوی کرتے جاتے تھے۔ آخر کار اس کام کو اس وقت کرنے کا ارادہ کیا جب کہ خود ان کے پاس وقت بہت ہی کم بچا تھا۔ اس میں سے بھی کئی سال ان کی قوم نے ان سے چھین لیے اس طرح مطالب القرآن کے چھ حصوں میں سے صرف ایک حصہ کی تصنیف ہو سکی جو کو ۱۹۱۸ء میں ان کے لڑکے بشیر الدین احمد نے شمسی پریس سے جو کہ نذیر احمد کا ذاتی پریس تھا شائع کیا۔

---

[1] بحوالہ علیگڑھ میگزین ۱۹۶۱ء ص ۳۱-۳۲

نذیر احمد نے اس تفسیر کا انداز بہت ہی انوکھا رکھا ہے۔اس میں انھوں نے قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب سے ان کی تفسیر نہیں لکھی بلکہ قرآن کے تمام مضامین پر غور کیا اوران تمام مضامین کو چھ خاص عنوانات (۱) معتقدات (۲) احکام متعلقہ عبادت و معاملات (۳) تاریخی مضامین و قصص (۴) پیغمبر صاحب اوران کے معاصرین کے حالات (۵) عالم معاد (۶) متفرقات' ان سب میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لیے اس کتاب کا ایک ایک حصہ مقرر کیا مگر اس کتاب کا صرف ایک ہی حصہ ''معتقدات'' ہی مکمل ہو سکا باقی پانچ حصے لکھنے کا ان کی زندگی نے موقع ہی نہیں دیا۔

غرضیکہ نذیر احمد کی تقریروں سے ان کے ان ضابطوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس سے ان کی مذہبی تصنیفوں کے منبع کا سراغ بہ آسانی لگ سکتا ہے اوران کی تصانیف کا مقصد ذہن نشیں ہوسکتا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''..........مگر میں اپنی طرف سے گوش گذار کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ میں اپنے ترجمہ قرآن کے شروع میں مطالب،قرآن کی مطلب وار ایک فہرست بنا کر لگا دی ہے لیکن ہر ایک مضمون کی جتنی آیتیں جہاں جہاں قرآن میں ہیں سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔بس مذہبی مواد تو تیار ہے اب اس میں سے نصابوں کا انتخاب کرنا ہے۔گر مجھ سے رائے لی جائے تو میں آدمی کی عمر کے اعتبار سے نصابوں کو ترتیب دوں۔آدمی کی عمر کے ہر حصے میں ثم انشئناً خلقاً آخر کا مصداق ہوتا رہتا ہے۔وہ پانچ حصے ہیں طفلی،عنفوان،شباب، وقوف' اور ایک حصہ معاد کا ہے کہ وہ اس زندگی سے متعلق ہے جو بعد مرگ پیش آئے گی۔میں تو اسی طرح کے نصاب کبھی بنا چکا ہوتا مگر لکیروں کے فقیروں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو نصاب بھی بناؤں اور میں آپ ہی اس کو بیٹھا

پڑھا بھی کروں اور ہدف لعنت بنوں سو الگ جو لوگ رفارم
(اصلاح-اصلاح) پکار رہے ہیں چاہے جس غرض سے پکارتے ہوں میری
آج کی بات سن رکھیں و لیبلغ الشاھد الغائب کہ مسلمانوں کی قومی
رفارم تو جب کبھی ہوگی اس صورت سے ہوگی کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کی
جائے اور مسلمانوں کے مذہب کی اصلاح جب کبھی ہوگی اسی صورت سے
ہوگی کہ یہ لوگ قرآن کے سوائے کسی مذہبی کتاب کو ہاتھ نہ لگائیں تفسیر،
حدیث اور فقہ۔ قرآن ہی ایک کتاب ہے جس پر تمام اسلامی فرقوں کا اجماع
ہے باوجود باہمی اختلاف ہرگز قرآن کی تعلیم نہیں بلکہ تعلیم اگر ہے تو تفاسیر کی،
احادیث کی، مسائل فقہ کی یا کوئی صاحب مجھ کو بتادیں کہ اختلاف آئے تو
کہاں سے آئے۔ قرآن کے حق میں تو خود خدائے تعالیٰ ع تصنیف را مصنف
نیکو کند بیان فرماتا ہے .... یعنی قرآن کے منزل باللہ ہونے کی دلائل
میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیم میں اختلاف نہیں۔'' [1]

اس کے لکچر کے علاوہ بھی نذیر احمد نے کئی لکچروں میں دینی نصاب کا ذکر چھیڑا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے دینی نصاب کی تیاری پر زور دیا ہے اور آخر میں خود ہی اپنے طور پر تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کی تیاری میں مرکزی حیثیت قرآن مجید کے خیالات، دستور العمل اور ادب کو دی گئی ہے۔ نذیر احمد کو یقین تھا کہ قرآن شریف سے براہِ راست رشتہ قائم کرنے سے ہی باہمی تفرقوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ مسلمانوں کے باہم تفرقوں کو ختم کرنے کی غرض سے ہی انھوں نے دینی کتابوں کی تصنیف اور ان کی تیاری میں حتی الامکان قرآن ہی سے مدد لیا۔ نذیر احمد کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے آپسی اختلافات ختم ہو جائیں اور مذہب اسلام ایک مرتبہ پھر اسی طرح دنیا کے لیے راہ ہدایت بن جائے۔

---

[1] لکچروں کا مجموعہ 'دربار ی لکچر نمبر ۴۰' ۱۹۰۳ء بمقام دہلی، جلد دوم ص ۶۰-۵۹

نذیر احمد نے انگریزی ترجموں، عربی ترجموں اور دینی تصانیف سے اُردو زبان میں گراں قدر سرمائے کا اضافہ کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے پینل کوڈ کے ترجموں کے ذریعہ اُردو میں اصلاح سازی کی بنیاد مستحکم کی اور اسے ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ اپنے ترجموں سے انھوں نے اُردو میں اس فن کی ایک جاندار روایت قائم کی۔ دوسری جانب خیالات کو اخذ کر کے ان کو اپنے ماحول میں پیش کرنے کا طریقہ بھی بتایا اور اس کے رموز و اسرار سے بھی آگاہ کیا۔

نذیر احمد نے اپنی محنت اور اعلیٰ ذہانت سے ترجموں کو تخلیق کا درجہ عطا کیا اور وقت کے لحاظ سے اس کام کے لیے کتابوں کے انتخاب کا گُر بھی بتایا۔ سرچشمہ زبانوں سے اپنی زبان کی ترقی کے لیے استفادہ کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ ان کے ترجموں کے ذریعہ سے اُردو زبان میں بے شمار الفاظ داخل ہوئے اور بہت سے غیر مانوس الفاظ زبان زدعوام ہو گئے۔ لفظوں کی بعض مانوس شکلوں کو انھوں نے اپنے ترجموں کے ذریعہ رواں کیا وغیرہ۔ ان کی اصطلاحیں براہ راست مطلب ادا کرنے والی ہوتی ہیں۔ ان کے ترجمے اصل تصنیف کی روح کو اسیر کر لیتے ہیں جو ترجمہ کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اس طرح نذیر احمد کے تراجم بھی ان کے اہم کارناموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں اور ان کی دینی کتابیں علیگڑھ تحریک کے ایک بڑے مشن کو پورا کرتی ہیں۔

انگریزی ترجموں ہی سے نذیر احمد کے اسلوب تحریر کی تشکیل ہوئی جو متنوع، رنگارنگ اور دلکش ہونے کے علاوہ ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔

□□□□

خلاصۂ کلام

کسی تخلیق کار کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرنے کے لیے اس کے عہد و ماحول کا مطالعہ ناگزیر تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ ہر تخلیق کار اپنے ادبی ماحول و فضا کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کرتا ہے اور بہ اقتضائے وقت اپنے موضوعات ومضامین کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ دور تعلیمی اور اخلاقی، سیاسی وسماجی اور مذہبی وملی اعتبار سے ایک انقلاب آفریں دور تھا۔اس دور میں مختلف اصلاحی تحریکیں چل رہی تھیں جس کا تذکرہ گذشتہ ابواب میں کیا جاچکا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مغربی تہذیب آہستہ آہستہ پورے معاشرے پر اثر انداز ہورہی تھی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد ان ہی تبدیلیوں کا عہد تھا۔معاشرے میں کافی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔نذیر احمد اپنے دور کے ایک عظیم مفکر اور مصلح تھے لہٰذا انھوں نے نئی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار بہت موثر انداز میں کیا۔انھوں نے اپنے ناولوں اور لیکچروں کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی اور موجودہ معاشرتی صورتِ حال کو مدنظر رکھ کر ہی ناول لکھنا شروع کیا۔انھوں نے معاشرے کے غلط رسم ورواج، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، توہم پرستی جیسے عیوب سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہورہی تھی اس کو اپنے مختلف ناولوں میں اس طرح اجاگر کیا کہ عوام ان برائیوں اور عیوب کو سمجھ کر ان سے بچنے کی کوشش کریں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''مرأۃ العروس'' میں معاشرے کے غلط رسم و رواج کی طرف اشارہ کیا۔ مذہب کے نام پر ہونے والی فضول خرچیاں جو تنگدستی کا ذریعہ بن جاتی ہیں ان سے لوگوں کو خبردار کیا۔ شبِ برأت کے موقع پر لوگ عبادت سے زیادہ نام نمود کے لیے بے جا اصراف پر توجہ دیتے تھے جس کی مذہبی حیثیت کچھ بھی نہیں جب کہ ایسی مقدس اور مبارک راتیں عبادت میں بسر ہونی چاہئیں۔

مولوی نذیر احمد کے عہد میں یہ رسمیں صرف دہلی اور نواح دہلی میں ہی نہیں بلکہ کم و بیش پورے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں رائج تھیں جن میں بعض رسومات آج بھی جاری و ساری ہیں حالاں کہ ذات برادری کی تقسیم، اونچ نیچ اور سماجی نابرابری کی اسلام میں کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

مولوی نذیر احمد معاشرے کی ان خرابیوں اور برائیوں کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ اسلام نے اخلاق و کردار کی بنیاد پر شرافت کا جو معیار قائم کیا ہے نذیر احمد اس کے حامی اور پرستار ہیں۔ اس دور کے معاشرے میں کمسنی کی شادی کا رواج عام تھا۔ نذیر احمد کمسنی کی شادی کے بھی مخالف تھے چنانچہ وہ اس کی بھی مخالفت کرتے تھے اور ''فسانۂ مبتلا'' میں انھوں نے کم عمری کی شادی پر سخت تنقید کی ہے۔

اسی طرح نذیر احمد تعدد ازدواج کے قائل نہیں تھے۔ وہ صرف ایک شادی کو ہی معاشرے کے لیے اچھا سمجھتے تھے۔ ایک سے زیادہ شادیوں کے برے نتائج کو انھوں نے فسانہ مبتلا میں بڑی صفائی سے پیش کیا ہے۔

نذیر احمد نے زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے شادی کو ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو کاہلی اور آرام طلبی ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے ان کو جہدِ عمل کا پیغام بھی دیا ہے۔ مسلمانوں کو

ترقی حاصل کرنے کے لیے تجارت کی ترغیب دی ہے۔ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمان تجارت کی طرف مائل نہیں ہوں گے اس وقت تک معاشرے میں ترقی ممکن نہیں ہوسکتی کیوں کہ مغربی قوموں کی ترقی تجارت ہی سے بامِ عروج تک پہنچی۔

نذیر احمد نے اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنی شاعری کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نذیر احمد نے اپنی شاعری سے وہی کام لیا جو اپنی تحریر و تقریر سے لیا ہے۔ اپنے لیکچر کے درمیان اپنے اشعار سے مجمع پر چھا جاتے تھے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے یہاں تک کہ پورا مجمع نذیر احمد کے اشعار گنگنانے لگتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نذیر احمد کی شاعری کا اثر عوام کے ساتھ ساتھ اس دور کے شاعروں پر بھی ہوا۔ مثال کے طور پر ان کے یہ چند اشعار قابل ذکر ہیں جو ان کے اصلاحی مشن کو آگے بڑھانے میں بہت کارگر ثابت ہوئے ؎

نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلاف دین و مذہب کو

عجب بدعقل ہے انساں کہ باایں دعویٰ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو

اگر تعلیم دیں یہ ہے آخر کار سن لینا
کے خود مکتب کے لڑکوں نے کیا برباد مکتب کو

بچایا ڈوبنے سے کشتیٔ دین محمد کو
الٰہی! نوحؑ کی سی عمر دے سرسید احمد کو

یہ حقیقت ہے کہ نذیر احمد کی نظمیں مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی سے پاک وصاف ہیں چنانچہ ان کی نظموں کے بیش تر موضوعات، قومی وملی اور مذہبی واخلاقی جذبے سے معمور ہیں اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے، برائی سے بچنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

غرض کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کی مہم میں مذہب کو بنیاد بنایا اور مذہب کے مثبت پہلو کو اجاگر کیا۔ ایک صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل کرنے کی کوشش کی اور ان کی اصلاحی کوششوں کی بدولت مسلم معاشرے میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس طرح انھوں نے معاشرے میں جو اصلاحی قدم اٹھایا وہ آج بھی منزل مقصود کی جانب گامزن ہے۔

❑❑❑❑

کتابیات

نذیر احمد کی تصنیفات وتالیفات

تصنیفات وتالیفات مع سال تصنیف	مرتب یا مہتمم	مطبع مع سال اشاعت
۱-توبۃ النصوح ۱۸۷۳ء	منشی بھگوان دیال	منشی نول کشور کانپور، جولائی ۱۸۸۷ء
" "	———	بار سوم مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۷۴ء
" "	———	صدیقی پریس دہلی ۱۸۹۷ء تیسرا ایڈیشن
" "	———	مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۷ھ
" "	پی سی کیور سپرنٹنڈنٹ	مطبع نول کشور لکھنؤ بار ہشتادہم
" "	شمس العلما ضیا	جید برقی پریس دہلی ۱۹۲۸ء
" "	ناشر کتب خانہ نذیریہ	بائیسویں بار (سال اشاعت درج نہیں)
۲-بنات النعش	محمد مسلم احمد ایم۔اے	یونین پریس اُردو بازار دہلی ۵۱-۱۹۵۰ء
۳-ابن الوقت	———	مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۶ھ پہلا ایڈیشن
" "	منذر احمد نبرۂ نذیر احمد	جید برقی پریس دہلی
" "	مصنف مرحوم	۱۳۶۰ھ/ ۱۹۱۴ء بارنہم
" "	رام نرائن بینی مادھو	پرنٹرس کوہ نور فائن آرٹ اینڈ لیتھو ورکس الہ آباد
۴-ادعیۃ القرآن ۱۳۱۲ھ	محمد قاسم خوشنویس ومالک مطبع	مطبع قاسمی دہلی ۱۳۲۱ھ
۵-امہات الامۃ	مولانا راشد الخیری	ادریس المطابع دہلی ۱۹۳۵ء اشاعت دوم
۶-ایامیٰ ۱۸۹۱ء	نذیر حسین کتب فروش	فیضی دہلی باراول
" "	منذر احمد	دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، طبع چہارم
۷-چند پند ۶۷-۱۸۶۶ء	محمد نذیر حسین تاجر کتب	صدیقی پریس دہلی (سن اشاعت درج نہیں)
۸-دہ سورہ واحسن صورہ ۱۹۰۷ء	محمد رحیم بخش	شمس پریس دہلی ۱۹۰۷ء

تصنیفات وتالیفات مع سال تصنیف	مرتب یا مہتمم	مطبع مع سال اشاعت
۹-رسم الخط ۱۸۷۷ء	محمد مقتدیٰ خان شیروانی	انسٹی ٹیوٹ علیگڑھ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء
۱۰-رویائے صادقہ ۱۸۹۲ء		کتبہ مشتاق احمد خاں رامپوری (سن اشاعت درج نہیں)
" "	منذر احمد نبیرۂ مصنف	دلی پرنٹنگ پریس ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۹ء طبع چہارم
" "	نذیر حسین تاجر کتب	مطبع صدیقی دہلی ۱۸۹۴ء طبع اول
۱۱-صرف صغیر سن تصنیف ۱۸۷۰ء	محمد مقتدیٰ خاں شیروانی	محبوب المطابع دہلی، مطبع انسٹیٹیوٹ علیگڑھ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء
۱۲-قرآن مجید مترجم (مع اضافہ)		مطبع قاسمی دہلی ۱۳۲۳ھ
جدید غرائب القرآن ۱۸۹۵ء		
قرآن مجید مترجم	مولوی بشیر الدین احمد	مفید عام آگرہ ۱۹۲۳ء
۱۳-مبادی الحکمت ۱۸۷۱ء	کتب خانہ نذیریہ	جدید پنٹنگ پریس دہلی
۱۴-مجموعہ نظم بے نظیر	محمد قادر علی خاں صوفی حسب فرمائش مولوی بشیر الدین احمد	مفید عام اسٹیم پریس ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء
۱۵-فسانہ مبتلا المعروف محصنات ۱۸۸۵ء	منذر احمد نبیرۂ نذیر احمد	دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۳۱ء
	با اجازت مصنف	مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۷ء بار اول
	مجلس ترقی ادب لاہور	پریس کا نام اور سن اشاعت درج نہیں
	محمد مسلم احمد ایم۔اے	دارالاشاعت مسلم منزل کھاری باؤلی دہلی
۱۶-مراۃ العروس ۶۸-۱۸۶۷ء	زیر نگرانی شاہد احمد دہلوی	دلی پرنٹنگ ورکس دہلی (سن اشاعت درج نہیں)
	زیر اہتمام پی سی کپور	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ (سن اشاعت نہیں)
		سور لیتھو پریس دہلی (سن اشاعت نہیں)
		مطبع مجتبائی دہلی، ماہ جون ۱۹۰۷ء

تصنیفات وتالیفات مع سال تصنیف	مرتب یا مہتمم	مطبع مع سال اشاعت
۱۷-مصائب غدر	کتب خانہ نذیریہ زیر نگرانی مسلم احمد نظامی ایم اے نبیرۂ مترجم	جدید پرنٹنگ پریس دہلی
۱۸-مطالب القرآن	ناشر نذیریہ کتب خانہ دہلی	
۱۹-منتخب الحکایت	مسلم احمد	محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۱۶ء طبع دوازدہم
۲۰-مواعظ حسنہ	مجلس ترقی ادب لاہور	مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء
۲۱-نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ جلد اول	مرتبہ بشیر الدین احمد	مفید اسٹیم پریس آگرہ ۱۹۱۸ء
۲۲-نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ جلد اول		
۲۳-نصاب خسرو ۱۸۸۷ء	محمد مقتدیٰ خاں شیروانی	انسٹیٹیوٹ علیگڑھ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء
۲۴-مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد	محمد ناصر خاں	فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ

□□□□

دیگر مصنّفین کی اُردو تصنیفات کی فہرست

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
۱-ادب اور تنقید	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	نیشنل آرٹ پرنٹنگ پریس الہ آباد	۱۹۶۸ء
۲-اردو کا پہلا ناول "خط تقدیر" مولوی کریم الدین (جدید ایڈیشن)	مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ریڈر، صدر شعبہ اُردو گورکھپور یونیورسٹی	دانش محل لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۳-اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ	اگست ۱۹۶۲ء
۴-اُردو کا پہلا ناول نگار شمس العلماء نذیر احمد	اویس احمد بی۔اے آنرز	مطبع اسرار کریمی جانسن گنج الہ آباد	۱۹۳۴ء
۵-اُردو کے اسالیب بیان (چوتھا ایڈیشن)	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ	وجاہت پرنٹنگ پریس	۱۹۴۹ء
۶-اُردو زبان اور داستان گوئی (جدید ایڈیشن)	کلیم الدین احمد	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۷-افادات مہدی، ایم مہدی (افادی الاقتصادی)	مرتبہ جناب بیگم مہدی صاحبہ	سرفراز قومی پریس	۱۹۵۰ء
۸-اقبال اور سیاست ملی (طبع اول)	رئیس احمد جعفری ندوی	فیروز اینڈ سنز لمیٹڈ کراچی	
۹-اقبال دلہن ۱۹۰۸	مولوی بشیر الدین احمد	ناشر منذر احمد طبع چہارم	
۱۰-امریکی ناول	مترجم سید وقار عظیم		
۱۱-انگریزی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد یٰسین	انجمن ترقی اُردو ہند مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ	مارچ ۱۹۷۰ء

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
۱۲-انجمن ترقی اُردو کی کہانی	مرتبہ مولوی غلام ربانی	انجمن ترقی اُردو ہند دہلی	۱۹۳۳ء
۱۳-بچیوں سے دو دو باتیں	ممتاز بشیر بیگم	شمسی مشین پریس آگرہ	۱۹۲۳ء
۱۴-بزم رفتگاں	راشد الخیری	عصمت بک ڈپو، دہلی	
۱۵-تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ	رام کمار پریس وارث نول کشور لکھنؤ	
۱۶-تاریخ نثر اُردو بنام تاریخی نمونہ منشورات حصہ اول	احسن مارہروی	مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ	
۱۷-ترجمان القرآن جلد اول	ابوالکلام آزاد	مکتبہ اشاعت ادب لاہور	۱۹۴۵ء
۱۸-ترقی پسند ادب	عزیز احمد	خواجہ پریس دہلی	۱۹۴۵ء
۱۹-تذکرہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد	محمد مہدی	تاج پرنٹنگ پریس	
۲۰-تنقید اور انداز نظر (بار اول)	ڈاکٹر سیدہ جعفر	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۲۱-تنقید اور تجربہ	جمیل جالبی	باب الاسلام پریس	۱۹۶۷ء
۲۲-پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار	ڈاکٹر قمر رئیس	کوہ نور پریس دہلی	۱۹۵۹ء
۲۳-جائزہ تراجم قرآنی	محمد سالم قاسمی وغیرہ	مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند	جولائی ۱۹۶۸ء
۲۴-حالی کی اُردو نثر نگاری (طبع اول)	ڈاکٹر عبدالقیوم	مجلس ترقی اُردو لاہور	دسمبر ۱۹۲۴ء
۲۵-حیات النذیر	افتخار احمد بلگرامی شمہ مارہروی	شمس پریس دہلی	۱۹۳۹ء

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
۲۶-حیات اجمل	مرتبہ عبدالغفار	مدینہ پریس بجنور پبلشر انجمن ترقی اُردو ہند علیگڑھ	
۲۷-حیات سرسید	نورالرحمٰن	جید برقی پریس دہلی پبلشر انجمن ترقی اُردو ہند	
۲۸-حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین اعظم گڈھ	
۲۹-خطبات عبدالحق	انجمن ترقی اُردو ہند دہلی	لطیفی پریس دہلی	۱۹۳۹ء
۳۰-خلاصہ کاروئی یازدہ سالہ ۹۶-۱۸۸۶ء	محسن الملک	مفید عام آگرہ	۱۸۹۷ء
۳۱-دل کی پیتا	شاہد احمد دہلوی	نذیر پرنٹنگ پرنٹنگ ورکس کراچی	
۳۲- دلی کالج اُردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر)	خواجہ احمد فاروقی	دلی پرنٹنگ پریس	۱۹۵۳ء
۳۳-سرشار ایک مطالعہ	پریم پال اشک	یونین پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۴ء
۳۴-سرکشی ضلع بجنور	سرسید احمد خاں صدر امین بجنور مرتبہ شرافت حسین مرزا	مشہور آفسیٹ لیتھو پریس کراچی	
۳۵-سیر المصنّفین حصہ دوم	محمد یحییٰ تنہا	جامعہ پریس دہلی (باراول)	۱۹۲۹ء
۳۶-عظمت رفتہ (باراول)	ضیاءالدین احمد برنی	تعلیمی مرکز کراچی	۱۹۶۱ء
۳۷-علی گڈھ تحریک	مرتبہ نسیم قریشی	مسلم پریس لکھنؤ (اشاعت اول)	۱۹۶۰ء

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
۳۸-ذوق ادب اور شعور (باراول)	سید احتشام حسین	ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۳۹-رسوم ہند	رائے بہادر پیارے لال آشوب کپتان ڈبلیو جے ہالرائیڈ	مجلس ترقی اُردو	۱۹۶۱ء
۴۰-روایت اور بغاوت (طبع دوم)	سید احتشام حسین	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۵۴ء
۴۱-روسی ادب حصہ دوم	محمد مجیب بی۔اے (آکسن)	انجمن ترقی اُردو ہند دہلی	۱۹۴۰ء
۴۲-سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	یونین پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۰ء
۴۳-غالبؔ اور آہنگ غالبؔ	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	انجمن ترقی اُردو ہند	۱۹۶۲ء
۴۴-فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	انجمن ترقی اُردو ہند	۱۹۶۲ء
۴۵-فن اور فنکار	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدآباد	
۴۶-فن اور تنقید	انور کمال حسینی		۱۹۶۲ء
۴۷-گنجینۂ گوہر (باراول)	شاہد احمد دہلوی	سعیدی پریس، ناز مکتبہ نیادور کراچی	۱۹۶۱ء
۴۸-ماسٹر رام چندر	ڈاکٹر سید جعفر		
۴۹-ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن خاں قدوسی ایم۔اے (علیگ)	ادبی پرنٹنگ پریس ممبئی-۸	۱۹۶۱ء
۵۰-مجموعہ لکچرز و اسپیچیز محسن الملک (باراول)	مرتبہ فضل الدین	نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس لاہور	۱۹۶۲ء

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
۵۱-محمد حسین آزاد جلد اول و دوم	ڈاکٹر اسلم فرخی	انجمن ترقی اُردو پاکستان	۱۹۶۵ء
۵۲-مقالات سرسید حصہ پنجم	مولانا اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب لاہور	
۵۳-مقالات سرسید حصہ نہم	مولانا اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب لاہور	
۵۴-مقدمات عبدالحق حصہ اول	مرزا احمد بیگ	مکتبہ ابراہیمیہ	
۵۵-مرحوم دہلی کالج	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو ہند دہلی	۱۹۴۵ء
۵۶-مرزا محمد ہادی رسوا سوانح حیات اور ادبی کارنامے	ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری ایم۔اے، پی ایچ ڈی	مجلس ترقی ادب-۲ کلب روڈ لاہور	۱۹۶۳ء
۵۷-مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل (باراول)	سید محمد طفیل منگلوری (علیگ)	نظامی پریس بدایوں	۱۹۲۵ء
۵۸-مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید محمد طفیل منگلوری	مطبع علیمی دہلی	۱۹۴۵ء
۵۹-مصنفین اُردو	مرتبہ سبزواردی	حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی	۱۹۳۹ء
۶۰-مضامین سلیم جلد دوم	سید وحیدالدین سلیم پانی پتی	کل پاکستان انجمن ترقی اُردو	۱۹۶۱ء
۶۱-موج کوثر (ساتواں ایڈیشن)	شیخ محمد اکرم	فیروز سنز لاہور	۱۹۶۶ء
۶۲-مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ............	مرزا فرحت اللہ بیگ	الجمعیۃ پریس دہلی	۱۹۵۶ء
۶۳-مولانا شبلی اُردو کے بہترین انشاء پرداز	سعید احمد انصاری بی۔اے	الناظر پریس لکھنؤ	۱۹۳۴ء
۶۴-ناول کیا ہے؟ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر احسن فاروقی ونوارالحسن ہاشمی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	جولائی ۱۹۶۰ء
۶۵-ناول کی تاریخ اور تنقید (باراول)	سید علی عباس حسینی	انڈین بک ڈپو لکھنؤ	

نام کتب	نام مصنف یا مرتب	ناشر یا مطبع	سن اشاعت
٦٦-نصیحت کا کرن پھول	مولانا حسین آزاد	جمال پریس دہلی	
٦٧-ہندوستان مسلمان آئینہ ایام میں (پہلا ایڈیشن)	سید عابد حسین	یونین پرنٹنگ پریس دہلی	جنوری ۱۹٦۵ء
٦٨-وقار حیات	(سرورق پھٹ گیا ہے)	(سرورق پھٹ گیا ہے)	
٦۹-یادرفتگاں	سید سلیمان ندوی	ضیاء برقی پریس	جنوری ۱۹۵۵ء
۷۰-نذیر احمد کے ناول	ڈاکٹر اشفاق محمد خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ (دوسرا ایڈیشن)	۲۰۰۰ء

□□□□